BANGALORE CITY UNIVERSITY

Course Title

BBA/BBA(T&T) BCA/BHA/BH,Science/BA.Mus/BA.FA (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy (SEP) 2024-25 and onwards

First Semester

Course Content: Afsanea , Nazmein , Grammar , Drama

Course Credits	Total Contact Hours	Summative
3	4/week	Assessment Marks =80
		Farmative Assessment Marks = 20

UNIT : 1

افسانے

۱) دیمک — غیاث احمد گدی
۲) وہ بوڑھا — صغرا مہدی
۳) کعبہ میرے پیچھے — م ن سعید
۴) شہر بند — عبدالصمد

UNIT : 2

نظمیں

۱) آزادی — علی سردار جعفری
۲) نوجوان سے — اسرارالحق مجاز
۳) سب مایا ہے — ابن انشا
۴) ہولی — نظیر اکبرآبادی

UNIT : 3

گرامر

۱) اسم اور اس کی قسمیں
۲) ضمیر اور اس کی قسمیں

UNIT : 4

ڈراما

کھیتی -- پروفیسر محمد مجیب

غیاث احمد گڈی

دیمک

یہ بھی کوئی جینا ہے۔ جی چاہتا ہے پنجرے کو پھونک کر کھلے آسمانوں کی طرف اڑ جاؤں۔

مگر اس ارادے کی تکمیل اتنی آسان نہیں۔ زندہ رہنے کی تمنا میں آدمی کو کتنی بار خودکشی کرنی پڑتی ہے اور مرنے تک زندہ بھی رہنا پڑتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے، ایک چھوٹی سی شمع جلانے کے لئے سارے گھر کو نذر آتش کر دینا پڑتا ہے پھر بھی شمع نہیں جل پاتی۔ حتیٰ کہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے کوئی غریب خود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

''کیا مر گئے وہاں جا کر یا بہرے ہو گئے؟''

میری بیوی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کتنی کڑوی گولی ہے یہ۔ شادی سے پہلے جس نغمے کے لئے میرے لب ہی نہیں روح تک ترس رہی تھی، شادی کے چند سالوں بعد وہی ''نغمہ'' دل کو جلانے لگا ہے۔ مگر خیر، اچھا ہی ہوا، ورنہ الٹی سیدھی سوچ کر میں باولا ہوا جا رہا تھا۔ ریشم کی جس ڈور کو میں اپنے گلے کے گرد کسنے لگتا ہوں، میری بیوی سعیدہ کی آوازہ کا تیز چاقو فوراً اسے کاٹ ڈالتا ہے۔

''میں پوچھتی ہوں، آج افیون تو نہیں کھالی آپ نے؟'' اس بار سعیدہ میرے سر پر ایکدم سوار ہو گئی۔

''اوہ.....ہو.....آخر کیا ہوا کچھ کہو بھی تو.....؟

''حمیدہ کو پھر بخار آ گیا''

''تو میں کیا کروں۔''

میری بیوی سعیدہ رونے لگی، خلاف توقع یہ جواب پا کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنکھیں، ہائے وہ سعیدہ کی خوبصورت آنکھیں!

''اب مجھے اللہ موت ہی دیدے تو اچھا ہے؟'' وہ میرے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ ''میں پوچھتی ہوں پیدا کرتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا تھا۔ ...''

اس بار میں نے محسوس کیا کہ واقعی بات میں نے سخت کہہ دی ہے۔

بے حیائی سے ہنستے ہوئے میں نے کہا ''یہ غلط ہے۔ پیدا میں نے نہیں تم نے کیا ہے'' اور سعیدہ کی تھوڑی پکڑ لی۔ سعیدہ بھی مسکرا پڑی۔ پتہ نہیں کیوں۔..... پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے بڑی نرمی سے بولی۔ ''جایئے ناڈاکٹر کے پاس میری جوان بچی کو جانے کیوں بخار نہیں چھوڑتا۔''

"اچھا جاتا ہوں....."ایک سو ستر روپے میں چار بچے، ایک بیوی اور ایک اپنا جہنم۔ پھر یہ روز روز کی بیماری.....

"دیکھئے" پلٹ کر دیکھتا ہوں تو سعیدہ کچھ اور کہہ رہی ہے

''کیوں؟''

''جلدی سے آجایئے گا۔ بچے اسکول سے آرہے ہوں گے۔ ساتھ ناشتہ کیجئے گا۔''

''اچھا جلدی ہی آجاؤں گا۔.....تمہاری خوبصورت آنکھوں کی قسم''

ہنسنے لگی۔''آپ میرے کان کے بُندے کب لا رہے ہیں؟''

ہت تیری بیڑ یلزم کی۔تعریف آنکھوں کی کیجئے بات بُندے تک پہونچتی ہے۔جی میں آیا! پوچھ ہی لوں لگے ہاتھوں، یہ آنکھوں میں بُندے کب سے پہنے جانے لگے ہیں؟ مگر میں اس خوبصورت شام کو کیوں خراب کروں۔

رات گئے بچے تو سو چکے تھے، میں نے یوں ہی سعیدہ کو چھیڑا۔

''سعیدہ تمہاری آنکھیں بھی کیا چیز تھیں۔اگر اب بھی گال ابھرے ہوں تو یہ قیاست ڈھا سکتی ہیں''۔

''انہیں آنکھوں نے تو آپ کو انتخاب کیا تھا۔شادی سے پہلے جب میں نے اپنے دروازے پر دیکھا تھا، اسی وقت آپ مجھے پسند آگئے تھے''

''مگر اس وقت تم نے بڑی سخت ڈانٹ پلائی تھی''

''وہ تو اوپری دل سے، پھر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ہی سے میری شادی ہوگی.....ہاں تو اُس وقت آپ کتنے بدھو لگ رہے تھے''

''دراصل اس وقت میں تمہاری پیاری آنکھوں میں غوطہ زن تھا۔''

''اور آج.....؟''

''اور آج بھی تم مجھے ہر وقت انہیں میں پاسکتی ہو .....''

اور پھر یوں ہی چھیڑ چھاڑ میں آدھی رات ہوگئی۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔

آتش تو خیر اب بھی جوان ہے۔مگر جیب میں پیسے نہیں، اس پر چار بچے آنگن میں الگ کھیل رہے ہیں اور سعیدہ کے گالوں کی رونق مفلسی کا بوالہوس کتّا لوٹ لے گیا ہے۔

اب تو مجھے سعیدہ کی فکر سے زیادہ اور فکریں کھائے جاتی ہیں۔گھر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ یوں تھک تھکا کر بھاگتے سایوں کے پیچھے دوڑنا کیا معنی۔اس سے کیا حاصل، پندرہ آنے میں بھی سینما دیکھا جاتا ہے اور مزے سے سیزر کے دھوئیں اڑا اڑا کر دیکھا جاتا ہے۔لیکن تین دنوں کے بعد جیب میں پیسے آئے، سعیدہ کی آنکھوں میں وہ بات نہیں تھی۔ایک ڈوبکی لگانے کے بعد انسان دکھوں کو بھول

سکے، اس لئے سنیما کی طرف آپ سے آپ قدم اُٹھ گئے۔ وہاں جو بھیڑ کی موم بتیوں کو دیکھا تو معاً نظر اپنے کپڑوں کی طرف گئی، کپڑے صاف ستھرے تھے گویا دھوبی نے دو آنے لے کر چار آنے کی محنت کی ہو۔ اس لئے سکنڈ کلاس کے بجائے تین روپے چار آنے والے درجے کی طرف تاکی۔ لیکن غلط، حلیم شرر سے لیکر کرشن چندر تک کو پڑھ آئے۔ سب جھوٹ سراسر لغو ایک نظر میں مرنا تو دور کی بات ہے، یہاں تو بقول شخصے درجنوں نین بان چلائے گئے، سب بے سودے،۔ یہ موم بتیاں خود جلتی ہیں نہ دوسروں کو جلانا جانتی ہیں۔ اس مشینی دور میں جلنے جلانے والی بات سرے سے غلط ہے۔ اور یوں پانچ روپے لُٹ گئے۔

گھر آیا تو سیدہ نے تھیلی پھیلا دی ''ایک، دو، تین، چار پانچ..... تیرہ اور ایک؟''

سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ میرے ہاتھ آپ ہی آپ کنپٹیوں کی طرف گئے۔

''میں پوچھتی ہوں، اور ایک پانچ کا نوٹ کیا ہوا۔؟''

''گر گیا ایک نوٹ.....''

''گر گیا۔ کیسے گر گیا؟..... کہاں گر گیا؟"

''کیسے گر گیا، کہاں گر گیا؟ کوئی سوال ہے؟ نہیں بتاتے ہم تمہارے باپ کے نوکر ہیں۔''

بکھیڑا کون کھڑا کرتا ہے۔ کچھ اور کہہ دوں، سوچتا ہوں، مگر کیا کہوں۔

''ہائے کہاں گرا دیا۔ ایک نوٹ؟ ہائے سانپ سونگھ گیا، کچھ پھوٹئے تو۔''

''نہیں بولتے۔ تمہارے باپ کے کوئی نوکر ہیں''

''تو کیا میں تمہارے باپ کی نوکر ہوں۔ درجن بھر بچوں کو کیا اپنا کلیجہ کھلا دوں؟''

بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ملتی تو آدمی کانٹوں میں بھی چھلانگ دیتا ہے۔ آگ میں بھی کود پڑتا ہے۔ لیکن یہاں تو چاروں طرف سعیدہ ہی سعیدہ تھی۔ راہ فرار بند۔ سعیدہ اور سعیدہ کی ہائے ہائے۔

پھر پل بھر میں کنپٹیاں گرم ہو گئیں۔ انگلیوں میں لرزش ہوئی اور سوکھے رخساروں پر تڑا تڑ تین چار طمانچے پڑ گئے۔

بات ختم ہوئی چلئے اب آرام سے سوئیے، گہری نیند آئے گی۔

کوئی اب اس ایک سو ستر روپے ماہوار اور چار پانچ بچوں والے کلرک سے پوچھئے، وہ سینہ تان کر تلسی داس کے دوھے کا ایک بند، کہہ سنائے گا۔ دوہے کا مطلب یہ ہے۔

عورت ڈھول!۔ جانور ہوتے ہیں اسی لائق کہ انہیں پیٹا جائے۔ پیٹنے سے ہی وہ خوش رہتے ہیں۔

سوچئے تو یہ دلیل بھی کہاں تک درست کہ کھوئی ہوئی بہاروں کی تلاش میں مرد چاہے تو دھول پھانک سکتا ہے، عورت کو اس کی اجازت نہیں، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کو موم بتیاں بنا کر ان کے قریب بیٹھ کر جل مرنے کی سوچ سکتے ہیں اور پندرہ آنے

کی جگہ پانچ روپے پھونک سکتے ہیں۔مگر سعیدہ اب سوال نہیں کر سکتی۔ پانچ روپے وہ خرچ کر ڈالے تو مجرم کسی جوان لڑکے کے پہلو میں بیٹھنے کی خواہش بھی کرے تو گناہ عظیم۔

لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا، اب اس سے حاصل؟ ضمیر پاجی ہے اسے دھمکیاں دے کر سلا ڈالو یار۔ایسے وقت میں بھی یہی سوجھتی ہے اسے۔

مگر اس بیچاری سعیدہ کو کیا کروں، جو پہلو والے پلنگ پر بڑی سسک سسک کر رو رہی ہے۔

''سعیدہ؟ اے سعیدہ؟؟''

''جی'' رُندھے ہوئے گلے کی آوازہ کو میں پہچان سکتا ہوں۔

اسی وقت کہیں سے یہ خیال چھلانگ لگاتا ہے، تلسی داس نے سچ ہی کہا ہے شاید ایسا نہیں سوچتے۔ بیوی آخر بیوی ہے۔خود تلسی داس کو دیکھو۔اس نے اپنی بیوی رتنا کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ان سے ملنے کے لئے دریا کو لاش پر بیٹھ کر عبور کیا۔سانپ کو رسی سمجھ کر تھاما۔یہ شاعر لوگ ہمیشہ الٹی سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔

''سعیدہ ذرا اِدھر آنا''

سعیدہ چپ میری پائنتی کے قریب آ کھڑی ہوتی ہے۔

میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔اب کچھ کہنا چاہتا ہوں تو زبان نہیں کھلتی اور چپ رہوں تو دل بھرا بھرا ہے۔پھر ضمیر کانٹے الگ چبھو رہا ہے۔یہ وہ دوراہا ہے جہاں پہونچ کر ہمارے طبقے کے جوان عجب مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ایک طرف صدیوں کا غرور کہ عورت پیروں کی جوتی ہے، کم تر ہے.....زیادتی بھی ہو جائے تو وہ زیادتی نہیں، عورت کا حق ہے، جو غرور صدیوں سے گردن کو اکڑائے ہوئے ہے۔اچانک گردن جھکانے سے وہ ٹوٹتا سا معلوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ خود گردن ٹوٹنے لگتی ہے۔دوسری طرف دل کی حالت دگرگوں ہے۔جی چاہتا ہے، اپنی زیادتی پر سر پیٹ لوں اور سعیدہ کے قدوں پر گر پڑوں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں، چودہ برس سے جس پیار کو دل میں ایک پودے کی طرح بنائے رکھا ہے، اس کی جڑوں میں خراش سی پڑ گئی ہے۔آخر کیا کروں؟ کچھ نہیں کر پاتا۔اس کی انگلیوں کی نازک نازک پوروں کو سہلاتا ہوں.....

''چھوڑیے مجھے۔پہلے طمانچے اور اب یہ پیار، مجھے پسند نہیں یہ سب۔اللہ کرے مر جاؤں''۔

''ایسا نہ کہو، ایک بے چارہ پھر کس کے سہارے زندہ رہے گا''

''سب بناوٹی باتیں ہیں۔تھپڑ مارتے وقت کہاں سو گیا تھا یہ بے چارہ''

اب میں اس نادان کو کیا بتاؤں کہ یہ تھپڑ میں نے اس کے گالوں پر نہیں بلکہ خود اپنے منہ پر مارا ہے۔

''کیا کروں سعیدہ آج کل طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ سینہ کا درد پھر لوٹ آیا ہے۔ بات بات پر غصہ آتا ہے۔ اپنی مجبوریوں کو سوچ کر۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے''

سعیدہ وہ سب نہیں جانتی۔ وہ شاید یہی سمجھتی ہے کہ دراصل یہی زندگی ہے اور ان مصیبتوں کا چکر جہاں ختم ہوگا، وہ منزل ہوگی موت کی .... اُس کے اِدھر اُدھر کچھ نہیں۔ مزے میں سعیدہ ہی ہے جو صرف اتنا ہی سوچتی ہے۔ پڑھ لکھ کر لوگ خواہ مخواہ راستوں میں کانٹے بکھیر لیتے ہیں۔

''کہو.....!''

''یہ انگوٹھی دیکھی ہے آپ نے؟'' اس نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو میرے ہاتھ سے چھوایا۔ اندھیرے میں صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکا کہ وہ انگوٹھی ہے۔

''بہت اچھی ہے۔ مگر تم نے کہاں سے پائی؟''

سعیدہ نے شاید پہلی بات سنی دوسری نہیں۔ جھٹ بولی۔

ہاں بہت اچھی ہے۔ سونے کی ہے۔ آپ میرے لئے بھی ایک ایسی ہی انگوٹھی بنوا دیجئے نا؟''

''بنوا دوں گا ضرور بنوا دوں گا۔ اس ماہ کو میرا سالانہ بونس ملے گا۔ اس وقت بنوا دوں گا تمہیں ایک اچھی سی انگوٹھی.....''

واقعی اس بار میں نے بھی سوچا۔ چودہ سال میں، میں نے اسے کون سا زیور دیا ہے؟ بلکہ اس کی شادی کے زیور بھی میرے ہاتھ بک گئے۔

لیکن سعیدہ یہ انگھوٹی تمہارے پاس آئی کہاں سے'' ذرا تجسس ہوا خواہ مخواہ کی راز جوئی۔

''یہ انگوٹھی پڑوسن والی آمنہ کی ہے۔ وہ کل میکے گئی ہے نا؟''

''تو تمہیں دے گئی؟''

''ہاں کہنے لگی میرے بھائی جان دیکھ لیں گے تو ضرور چھین لیں گے؛ دیکھئے نا کیا زمانہ آ گیا ہے سگی بہن کو سگے بھائی کا اعتبار نہیں۔''

بات بڑی خوبصورتی سے ایک الگ راستے پر مڑ رہی تھی کہ اچانک سعیدہ کو اپنے کانوں کی بالیاں یاد آ گئیں۔

''ہاں تو ایک کام کیجئے۔ ابھی تو آپ انگوٹھی نہ بنوا سکیں گے مجھے وہ ایرنگ لا دیجئے جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

دوسرے روز دفتر سے واپسی پر صمد خان سے ایک روپیہ سود پر پانچ روپے قرض دے کر ایک نیو امریکن گولڈ کی خوبصورت سی ایرنگ خرید لی اور اکیلے کمرے میں سعیدہ کے کانوں میں اپنے ہاتھوں سے پہنا دیا..... ''جیو میری جان جب تک تمہارا جی چاہے۔''

''میرا کیوں، جب تک آپ کا جی چاہے۔ یوں کہتے'' تصحیح کر کے وہ مسکرانے لگی۔

امریکن گولڈ کی ساری خوبصورتی ماند پڑ گئی۔

ابا چائے پی لیجئے..... میری گیارہ سالہ بچی حمیدہ کی آواز آئی، جسے سن کر سعیدہ نے جلدی سے ایرنگ اتار کر بکس میں رکھ لیا۔ میں سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک افسانہ یاد آ گیا۔ جس میں ایک باپ اپنے بچے کے ندی میں بہہ جانے پر اس لئے مطمئن تھا کہ چلو اچھا ہوا۔ ورنہ دوسری طرح موت ہوتی تو کفن کے پیسے کہاں سے آتے۔

چائے اور ناشتہ آ گیا۔ اتنے میں اسکول سے بھاگتے، لڑتے جھگڑتے بچے بھی آ گئے۔

رات کو سعیدہ نے بڑے پیار اور خلوص سے ایک پیالے میں انڈے کا حلوہ لا کر رکھ دیا۔ لیجئے اسے کھایئے۔ دو چار دن کھایئے گا۔ چھاتی کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔''

کون کہتا ہے کہ سعیدہ کو مجھ سے پیار نہیں! وہ مجھے نہیں چاہتی۔..... یہ سونے کے رنگ کا حلوہ تو چکھو۔ دیکھو کتنی محبت سے بنایا ہے۔ ایک ذرا میں نے سینے کے درد کا ذکر کر دیا تھا کہ دوسرے دن حلوہ تیار ہو گیا۔

ابھی حلوہ چکھ ہی رہا تھا کہ تینوں بچوں نے مجھے گھیر لیا..... ماں نے انہیں سوتا ہوا سمجھ رکھا تھا اور وہ بڑی دریا دلی اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ بٹانے لگے ہیں اور یوں حلوہ ہم پانچ باپ بچوں میں اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح بٹ گیا۔

میں اور سعیدہ دونوں ہنسنے لگے۔ بچے بچارے کیا سوچتے ہوں گے کہ کس گھر میں جنم لیا ہے، جہاں چھوٹی چھوٹی چیز کو بھی جی ترس جاتا ہے۔ لیکن بچے اتنا ہی سوچتے۔ شکر ہے پروردگار تیرا، ورنہ پتہ نہیں تیری دنیا کب کی تباہ ہو گئی ہوتی۔

سعیدہ نے بچوں کو ایک کہانی سنانی شروع کر دی۔

''ایک تھا راجہ اور ایک تھی رانی.....!''

میں نے کہا ''ٹھہرو جی۔ یہ ہر روز ایک تھا راجہ ایک تھی رانی۔ ایک تھا حنیف اور ایک سعیدہ کیوں نہیں۔؟''

''تم اپنا کام کرو جی!.....

''ہاں تو ..... ایک تھا راجہ ایک تھی رانی۔ ان کے سات بچے تھے۔ وہ سب بڑی خوشی خوشی رہ رہے تھے۔ ہر طرح کا آرام تھا۔ آسائش تھی کوئی غم نہیں تھا'' ..... اتنا کہہ سعیدہ لمحے بھر کے لئے رکی۔ پھر بچوں کی طرف دیکھ کر بولی.....'' ہوں کاری دو جب کہوں گی ورنہ میں بھی سوتی ہوں''

تینوں بچے بلکہ حمیدہ تک نے بہ یک زباں کہا "ہوں ہوں"

''پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اُن کی راج گدّی چھن گئی اور وہ لوگ ایک دم سے کنگال ہو گئے۔ ایسے ہی جیسے ہم ہیں۔"

سعیدہ کوئی داستان گو نہیں، داستان طراز نہیں مگر جب کوئی کہانی کوئی قصہ سنانے لگتی ہے تو میری توجہ بھی کھینچ لیتی ہے۔لیکن بے چاری میں تھوڑی سی کمزوری ہے۔ وہ تشبیہ تمثیل دینے میں برابر چوک کرتی ہے۔ راجہ کنگال ہو گیا، ایسے ہی جیسے ہم ہیں۔.....وہ بے وقوف نہیں جانتی کہ ہاتھی بیٹھ بھی جائے تو گدھے سے اونچا ہی ہوتا ہے۔

"پھر اماں؟" صفیہ نے پوچھا۔

''پھر دن بھر وہ راجہ رانی گلی گلی بھیک مانگتے اور شام کو جب پکا کر کھانے بیٹھتے تو وہ ساتوں بچے سارے کا سارا کھانا کھا جاتے اور راجہ رانی ہر روز کی طرح اس دن بھی جھوٹے برتن چاٹ کر رہ جاتے....''

''یہ تم اپنے میکے کا قصہ سنا رہی ہو، جہاں لوگ دن کو بھی چراغ روشن کر کے بازاروں میں گھومنے نکلتے ہیں۔''

''تم چپ رہو جی۔'' سعیدہ کا موڈ اچھا تھا اس لئے کھل کھلا کر ہنسنے لگی، ورنہ میکے کی برائی بھی کسی عورت نے سسرال میں برداشت کی ہے۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میکے میں بھی سعیدہ کو فاقے کرنے پڑتے تھے اور ذرا ذرا چیز کے لئے ترسنا پڑتا تھا۔

''پھر ایک دن راجہ اور رانی نے ایک ترکیب سوچی''

''ارے سوچی ہو گی۔ ہمیں تم سونے بھی دو گی یا امیر حمزہ کی داستان چلتی رہے گی رات بھر؟''

آپ سو یئے نا۔ آپ کو کون کہتا ہے قصہ سنئے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ سعیدہ کے قصے کی کیا، اس کی کوئی تک ہے۔ ابھی تو راجہ رانی کنگال ہو گئے تھے۔ اختتام تک پہونچتے پہونچتے اب سنیں گے، ایک فقیر یا سادھو آیا اور اس نے ایک جادو کی چھڑی گھمائی اور وہ کنگال کنگالن پھر سے راجہ رانی بن گئے، یعنی ابتدا بھی غلط انتہا بھی غلط۔ راجہ سے کوئی کنگال نہیں ہوتا اور کنگال کے یہاں کوئی طلسمی چھڑی والا فقیر نہیں آتا۔

''اس کے بعد؟'' رفو بولا۔

''اس کے بعد سوچی ہوئی ترکیب پر راجہ رانی نے عمل کیا اس طرح کیا کہ ایک رات بچوں کو کھلا پلا کر سلا دیا اور دونوں رات کے وقت پھر مانگنے کے لئے نکل پڑے۔ رات گئے واپس آئے تو دیکھا کہ بچے گہری نیند لے رہے ہیں۔ ایک ایک کے قریب پہنچ کر انکو گھور گھور کر دیکھا جب اطمنان ہو گیا کہ واقعی بچے سو رہے ہیں تو پوٹلی کھولی اور آٹا گوندھ کر تیار کیا۔ پھر رانی نے راجہ سے آہستہ سے کہا۔

''ذرا دیکھنا روٹی پکانے والی چوکی کہاں ہے.....؟'' اتنے میں سب سے چھوٹی بچی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ رہی چوکی ماں۔'' اور وہ چوکی سامنے لا کر رکھ دی۔ رانی نے اس سے کہا ''چپ چاپ بیٹھی رہ۔ تیری بہنیں اٹھ جائیں گی۔'' پھر راجہ سے بولی۔ ''دیکھنا تو ذرا بلین کہاں ہے۔ دوسری لڑکی نے بستر پر سے جواب دیا۔ میں لاتی ہوں بلین۔''

راجہ اور رانی نے اسے بھی خاموش رہنے کو کہا ..... اور رب العزت کا شکریہ ادا کیا کہ اور لڑکیاں سو رہی ہیں۔ مگر رانی جیسے جیسے

ضرورت کی چیزیں تلاش کرتی گئی، بچیاں اٹھتی گئیں۔حتی کہ ساتوں اٹھ بیٹھیں۔

''بہت خوب''! میں اچھل پڑا، اس لئے نہیں کہ سعیدہ نے کوئی بہت عمدہ کہانی سنادی بلکہ اس نے پہلی بار کہانی میں حقیقت کا خیال رکھا۔اس بار کوئی فقیر یا سادھو بے چارہ نہیں آیا۔

''کیا بہت خوب؟''

''یہی کہ اب کنگال اور کنگالن کو تم نے پھر سے راجہ راتی نہیں بنادیا۔''

اس نے میری باتوں کا جواب نہیں دیا''تو بچو! اس طرح تم نے بھی آج ایک حرکت کی ہے۔آج تم نے اپنے ابا کو حلوہ نہیں کھانے دیا، وہ تمہارے ابا کی دوا تھی۔بُری بات ہے تم نیک بچے ہو، ایسی عادت ہرگز مت سیکھو، سمجھے۔''

کسی بچے نے ہونکاری نہیں دی۔سعیدہ نے پلٹ کر دیکھا تو سب کے سب سو رہے تھے۔وہ ناچار میری طرف متوجہ ہوئی۔

''سن رہے ہیں آپ؟ دیکھئے تو حمیدہ جوان ہو رہی ہے؟''

''تو اچھی بات ہے۔میں اس کے لئے دولہا تلاش کروں گا...''

''دولہا کو نہیں کہہ رہی ہوں عقلمند صاحب، حمیدہ سیانی ہو رہی ہے اسے اب دوپٹہ خریدنا پڑے گا۔''

میں جانتا تھا سعیدہ کیا کہنا چاہتی ہے اور یوں جو میں سعیدہ کے اشارے کا غلط جواب دے رہا ہوں تو اس میں زندہ رہنے کا ایک نکتہ پوشیدہ ہے یعنی حقیقت سے فرار۔

''اچھا بھئی، دوپٹہ لادوں گا''میں نے ٹالنا چاہا۔

''لیکن اس طرح تو مہینوں سے ٹال رہے ہیں .....اس طرح بھاگنے سے فائدہ؟ بھاگ کر کہاں جایئے گا؟"

سعیدہ سچ کہتی ہے بھاگ کر آدمی کہاں جائے گا دو پاٹوں کے بیچ سے کوئی ثابت بچا ہے جو میں بچوں گا؟ پھر سعیدہ نے آہستہ سے مجھے ایک بات بتائی کہ کسی طرح نکڑ والے پان کی دوکان میں بیٹھے چند آوارہ لوگوں نے اس کی لڑکی صفیہ کی طرف کنکر پھینکی اور اسے چھیڑا .... مجھے محسوس ہوا گویا کسی نے تیزاب چھڑک دیا ہو مجھ پر۔

واقعی جینا بہت مشکل ہے۔بھوکوں مر کر ننگے رہ کر، ایک ایک چیز کے لئے ترس ترس کر جینا کتنا بڑا کمینہ پن معلوم ہوتا ہے، افلاس کی چکی میں پستے پستے آدمی ایک روز اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔کتنی حسرت سے کہا جاتا ہے کہ روحانی مسرت تو دراصل غریبوں کو حاصل ہے۔ہم امیر لوگ تو اتنے بدنصیب ہیں کہ شراب کی قسمیں اور اس کی تاریخیں یاد کر کے خاک ہو جاتے ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

سوچ رہا ہوں کہ سالے کیسے پکڑے جاتے ہیں۔میں تو تھک سا گیا ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے۔

بڑی حسرت آمیز نظر سے سعیدہ دیکھتی ہے اور سُوپ میں دال لئے پھٹکتی پھٹکتی باورچی خانے چلی جاتی ہے شاید وہ نہیں جان پاتی کہ ایک سو ستر روپے میں پہلے ہی گذارمشکل تھی۔ یہ وہ چادر ہے کہ پیر ڈھکئے تو سر کھل جاتا ہے اور سر چھپائے تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں۔ صمد خان کے ایک سو چالیس روپے ہو گئے ہیں اور تقریباً پچاس روپے مزید بیاج کے۔ پھر بھی دودھ والے کا تین ماہ کا پیسہ چڑھ گیا ہے۔ دھوبی نے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا ہے۔ حمیدہ کو دوسرے تیسرے دن بخار لگ جاتا ہے، دوا نہیں آپاتی ہے۔ میرے سینے میں الگ درد اٹھتا ہے۔ اس پر دوسرے تیسرے ماہ حمیدہ کے لئے پانچ روپے ڈوپٹے کے لئے چاہئیں۔ یا پھر یہ کیجئے کہ اسے پردے میں بٹھا دیجئے۔ حمیدہ جوان ہو رہی ہے۔ باہر نہیں نکل سکتی بغیر ڈوپٹے کے۔ دنیا کے اخلاق کا جنازہ نکل گیا ہے۔ گیارہ سال کی بچی کو بری نظر سے تاکتے ہیں۔ لوگوں کی اپنی ماں بہن نہیں یا یہ کہ حمیدہ وقت سے پہلے کیوں جوان ہو رہی ہے۔ فطرت کھیل بھی رچتا ہے تو غریبوں سے۔ جی میں آتا ہے کہ آگ لگا دوں ان ساری کتابوں کو جن میں غریبی کو نعمتِ خداوندی کہا گیا ہے۔ بڑی مشکل ہے، ایک شریف آدمی کو اپنی لاج رکھنی بڑی مشکل ہے۔

بہر حال پانچ سات روپے خرچ کرنے ہی پڑیں گے۔ ڈھائی گز کپڑا حمیدہ کے گلے میں ڈال دیجئے تو کئی فائدے ہیں۔ نکڑ والی دوکان سے سودا سلف آجائے گا۔ دفتر میں دوپہر کا کھانا پہنچ جائے گا، نل پر سے ضرورت بھر پانی آجائے گا اور بھی چھوٹے بڑے بہت کام نکل سکتے ہیں۔ مثلاً ننھے کو لے کر خیراتی اسپتال جانا۔ کمپنی کے میدان میں خودرو پودوں میں سے ساگ چن کر لے آتی ہے۔ ڈھائی گز کے اس کپڑے کو گلے میں ڈال دیجئے تو واقعی بہت سے کام نکل سکتے ہیں۔ یا اسی کپڑے کو دروازہ پر لٹکا دیجئے تو پھر اندر مزے سے پڑے رہئے۔ ننگے رہئے۔ اگھارے رہئے کوئی بات نہیں۔ کسی بات کی شرم نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں، کیوں صاحب آپ کیسے جی رہے ہیں؟" بلکہ گلیارے گلیارے تعریفیں ہوں گی کہ حنیف میاں نے اپنی لونڈیا کو کتنی کم عمر میں ہی پردے میں بٹھا دیا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں شریف ..... آدمی!!

لیجئے صاحب دیکھ لی نا آپ نے ڈھائی گز کی کرامات؟ یہ پردہ بڑے کام کی چیز ثابت ہوا۔ انسان کی عزت آبرو کا امین بن گیا ..... آگے زبان مت کھلوایئے۔ بات شرع کے حدود کو پھاند جائے گی۔ بے پردگی شرعاً ممنوع ہے۔ ٹھیک ہے صاحب! بھوکوں مرنا بھی شرعاً ممنوع ہے .... پھر اس ننگے کے لئے کیا جس کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ نچوڑنے کو۔

انسان ہوں۔ شریف ہوں۔ غریب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شرافت کے ٹانکے ادھیڑنے لگے۔ یہ کیا کم دکھ کی بات ہے کہ آٹھ سال کا بچہ فیس نہ ملنے پر اسکول سے خارج کر دیا جائے، اور اب وہ سگریٹ کے ٹکڑے چن کہ پھک پھک دھوئیں اڑاتا پھر رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں، آج کسی نے حمیدہ پر کنکری پھینک دی۔ اسے چھیڑا.....

یہ پیچ و تاب کھاتا دفتر پہونچا۔ کام کرنے کی بجائے ساتھی کلرکوں سے ہنسی مذاق میں اپنا غم کھونا چاہا۔ فلم اسٹاروں کی جوانیوں کے

چرچے کئے۔انسانوں کی بات چھیڑی۔مطلب ہے بھاگنا چاہا حقیقت ہے۔لیکن سعیدہ سچ کہتی ہے۔بھاگ کر کہاں جایئے گا۔

واقعی بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔کہاں جا سکتا ہوں، چاروں طرف گہرے کنوئیں ہیں۔اندھیرا ہے۔تھوڑی سی روشنی کہیں نظر پڑتی ہے تو دوڑ پڑتا ہوں، دوڑ کر پکڑتا ہوں۔مگر روشنی تو کیا ہاتھ آئے گی، خود ہاتھ جل جاتا ہے۔

واپسی پر گھر میں ایک ہنگامے سے دوچار ہونا پڑا۔محلے کی کچھ عورتیں، مرد اور بچے میرے دروازے کو گھیرے تھے، اور وہ پڑوسن آمنہ جو کل ہی اپنے میکے سے واپس آئی تھی، ہاتھ پھینک پھینک کر مجھے اور میری بیوی کو کوس رہی تھی۔بات کیا ہوئی۔کیسا ہنگامہ ہے میرے گھر میں؟

پتہ چلا۔میکے چلے جاتے وقت آمنہ نے جو انگوٹھی اپنے بھائی کے ڈر سے میری سعیدہ کو دی تھی، وہ سعیدہ سے گم ہوگئی ہے اور وہ گھر کے سارے کونے کھدرے ڈھونڈ کر تھک ہار گئی تھی اور اب صرف آنسو بہا رہی تھی جس کا آمنہ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔عورت کے آنسو کامیاب ترین حربہ سہی، مگر اس ہتھیار سے اگر عورت ہی پروار کیا جاتا ہے تو وہ وار بیکار ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ ذلّت کا سامان بھی پیدا کرتا ہے۔چنانچہ آمنہ کے کوسنے میں لحہ بہ لحہ تیزی اور گرمی آتی جا رہی تھی اور وہ بڑی بے باکی سے ہمارے ایمان پر، ہمارے آبا و اجداد کی لاشوں سمیت پرجھاڑو پھرے جا رہی ہے۔

بہت دیر کی منّت سماجت کے بعد آمنہ اور اس کے شوہر کو اس بات کے لئے راضی کیا کہ آئندہ ماہ جب بونس ملے گا تو میں انہیں پہلی فرصت میں ایک سونے کی انگوٹھی بنوادوں گا۔

خدا خدا کر کے انہیں رخصت کیا۔اب سعیدہ کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔میں نے بڑے پیار سے اس کی تھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ان آنکھوں سے مجھے زندگی کی چھاؤں والی راحت ملا کرتی ہے۔انہیں کیوں بہا دینے پر تلی ہو؟ سعیدہ کچھ نہیں بولتی، بدستور آنکھوں سے آنسو گرانے لگتی ہے۔

آنکھیں، آنکھیں .....ہائے سعیدہ کی آنکھیں۔

لیکن .... لیکن.

لیکن سعیدہ، صرف آنکھیں ہی تو نہیں وہ ایک دل بھی تو ہے جو بے ایمان بھی ہوسکتا ہے، جو امانت میں خیانت بھی کرسکتا ہے ... میں الجھنے لگتا ہوں۔حالات انسان کو گرا سکتے ہیں۔سعیدہ گر بھی سکتی ہے۔لیکن اس سعیدہ کا کیا قصور۔رحیم نے ایک دوہے میں سچ ہی کہا ہے کہ دھتورا اور سونا اگرچہ دونوں میں نشہ ہے مگر دھتورے کے پینے کے بعد نشہ چڑھتا ہے تو سونا صرف چھو دینے سے ہی آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔پھر آج تک میں نے اس کے اصرار کے باوجود بھی کبھی کوئی زیور لا کر نہیں دیا۔آخر اس میں سعیدہ کی کیا خطا؟ لیکن ... لیکن ایسا

نہیں سوچنا چاہئے۔ میں خود اپنے آپ کو کمینہ محسوس کرنے لگتا ہوں، کچھ بھی ہو سعیدہ میری بیوی ہے۔ رفیق زندگی ہے۔ اپنی رفیق زندگی کی ذات سے یہ بے اعتمادی ... پھر میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ انگو بھی سعیدہ ہی نے رکھ لی ہے۔ وہ واقعی کھو بھی سکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کیا۔ وہ خیالات جو دماغ میں دھواں سا پھیلا رہے تھے انہیں دبانا چاہا....

لیکن شام تک وہ انگوٹھی مل گئی۔

خوشی سے جھومتی ہوئی مسکراتی سعیدہ انگوٹھی لئے میرے پاس آئی۔

''دیکھئے انگوٹھی مل گئی۔ صندوق کے دراز کے کونے میں رہ گئی تھی''

''مل گئی شکر ہے رب العالمین تیرا'' میں بولا۔

ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد اس نے گردن جھکا کر آہستہ سے کہا۔

''میں بھی کتنی گنہگار ہوں۔ سوچ رہی تھی انگوٹھی کہیں آپ نے رکھ لی ہو...''

صغرا مہدی

وہ بوڑھا

وہ لق ودق صحرا جہاں آدم نہ آدم زاد، ہر طرف ہو کا عالم، وہ بوڑھا چلا جا رہا تھا۔ لڑکھڑاتا ڈگمگاتا گرتا اور سنبھلتا، پیر راستے کے سنگ ریزوں اور خاروں سے فگار، آنکھوں پر بھاری پپوٹوں کا پردہ پڑا ہوا، کمر عمر کے بوجھ سے خم، فراخ پیشانی پر ان گنت لکیریں، جھریوں سے بھرے چہرے، غور وفکر عزم ویقین، امید ونا امیدی کے ملے جلے رنگ۔ وہ اس کے قریب آیا۔ اس نے سنا کہ بوڑھا کچھ کہہ رہا تھا، کان لگا کر سنا تو وہ منہ ہی میں کہہ رہا تھا:

میں اس صحرا کو پار کرلوں گا

میں اس سے نکل جاؤں گا

میں اپنی زندگی کی آخری سانس اس ویرانے میں نہیں لینا چاہتا۔ کیا میں نے ویرانوں کو اس لیے آباد کیا تھا؟ میں..... میں۔ اور پھر اس کا سانس پھولنے لگا، وہ ہانپ رہا تھا۔ وہ سوچنے گا کہ یہ بوڑھا کون ہے؟ کہاں جا رہا ہے ضعیف ولاغر بوڑھا جو گنتی کی سانسوں پر جی رہے ہیں، ان کے لیے کیا آبادی..... کیا ویرانہ..... کیا فرق پڑتا ہے کہ انھیں تو مرنا ہی ہے۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھے نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا اور اپنی سانس قابو میں کر کے بولا:

میاں صاحبزادے تم کون ہو، کہاں جاتے ہو؟

جی؟ میں؟ میں تو بس یوں ہی شکار کھیلنے کو نکل آیا تھا، بھٹک کر ادھر آ گیا اب اپنے گھر کو جاتا ہوں۔

تو تم شکار کرنے کا شوق..... بوڑھا مسکرا کر بولا

آپ میرا سہارا لے لیجیے۔.....

نہیں نہیں مجھے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چل سکتا ہوں، بغیر کسی سہارے کے۔ دیکھو دیکھو میں چل رہا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے ٹھوکر لگی اور اسے اگر جلدی سے بڑھ کر سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتا..... اور اب بوڑھے کو اس طرح سہارا دے کر چلنے لگا کہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ وہ اس کے سہارے چل رہا ہے۔ وہ چلتے رہے، آخر خدا خدا کر کے ایک درخت نظر آیا۔ بوڑھا تھک گیا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح پل رہی تھی۔

بڑے میاں آپ کون ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟

بس میاں اللہ کا بندہ ہوں

آپ یہاں کیوں آتے ہیں؟ سکون اور من کی شانتی کی تلاش میں.....

یہ سن کر بوڑھا مسکرا دیا، اس کے منہ پر وہ مسکراہٹ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

میاں صاحبزادے، ویرانوں اور جنگلوں میں من کی شانتی دل کا سکون رِشیوں منیوں کو ملتا ہے عام انسانوں کو نہیں۔.....

میں نے زندگی بھر ویرانوں کو آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اندھیروں میں دیے روشن کیے ہیں۔ میں نے نئی شاہراہیں تلاش کی ہیں۔ میں نے من کی شانتی آبادی میں کھوجی، انسانوں کے بیچ رہ کر اس کو تلاش کیا ہے اور وہ مجھے ملی۔

تو پھر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟

وہ بوڑھے کو باتوں میں لگا کر اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگا کہ اسے چلنے سے باز رکھنا چاہتا.....

مجھے نہ جانے کون یہاں لا کر چھوڑ گیا۔..... مجھے یاد بھی نہیں۔ میں اپنی زندگی کا حساب اگر برسوں سے لگاؤں تو وہ بہت لمبی بہت طویل لگتی ہے اور ان کاموں کے بارے میں سوچتا ہوں جن کے نہ کرنے کی حسرت میرے دل میں ہے تو بیحد مختصر لگتی ہے۔ چار دن۔ بس چار دن۔ ہاں آں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔

آپ اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

ہاں تو میں تمھیں یہ بتا رہا تھا کہ میں نے زندگی بھر ویرانوں کو آباد کیا۔ بستیاں بسائیں، نئی نئی شاہراہیں تلاش کیں، اندھیرے راستوں میں چراغ جلائے۔ میں یہ کرتا رہا اور پھر جب سر اٹھایا اور مانگے کے ماہ و سال کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اب مہلت بہت کم ہے۔ اب میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسے لوگوں کو کھوجنا شروع کیا۔..... بوڑھے کی سانس پھر پھولنے لگی تھی۔ وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔

آپ کو کس کی تلاش تھی؟ اس نے بوڑھے سے سوال کیا۔

ان لوگوں کی جو میری طرح ویرانوں کو آباد کریں اور اس سلسلے کو باقی رکھیں۔

تو وہ آئے؟

نہیں، میرے عزیز وہ مصروف تھے۔ ان کے پاس مجھ بوڑھے کی بات سننے کی فرصت نہیں تھی۔ ان کا وقت ان کے ساتھ تھا۔ میرا وقت مجھ سے بچھڑ رہا تھا۔

کوئی بھی نہیں آیا؟

نہیں ایسا تو نہیں، کچھ آئے، مگر انھوں نے کہا کہ ہم آبادی میں رہ رہے ہیں اور یہاں رہ کر ہم اپنے لئے زیادہ سے زیادہ آسانیاں

نہیں فراہم کریں گے؟ دوسروں کے لیے ویرانوں کو آباد کرنے سے حاصل؟

کچھ لوگوں نے مجھے خبطی بتایا اور کچھ کے نزدیک میرا یہ شوق فضول تھا اور بس کچھ کو منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ کچھ اپنے گھر میں بیٹھ کر خوش تھے کہ وہ تو گھروں میں بیٹھے ہیں۔.....اور یہ سب سن کر وہ میرے پاس دوڑی آتی۔

کون؟

وہی جسے میں نے کبھی منہ نہ لگایا۔ اس نے یقین دلایا کہ میری بات کوئی نہیں سنے گا، کوئی اس سلسلے کو باقی نہیں رکھے گا۔ میں اس سے نمٹ ہی رہا تھا کہ وہ آ کر میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی جسے بہت جتن سے میں نے زیر کیا تھا۔ یہ تم ہو جس نے اپنی عمر عزیز ویرانوں کو آباد کرنے، اندھیروں میں دیے جلانے میں برباد کر دی۔ تم نے آندھیوں کی پروا کی نہ طوفانوں کی اور اب۔ اب بھی تم اس فکر میں ہو کہ تمھارے بعد یہ سلسلہ جاری رہے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات بھی نہیں مانی تو وہ آ گئی جس نے ہمیشہ مجھے لب بام سے محو تماشا رہنے کی ہدایت کی اور لگی کہنے، تم سے جو ہو سکا وہ تم نے کیا، اب تمہارے بعد کیا ہوگا، اس کی فکر چھوڑو اور اب بیٹھ کر موت کا انتظار کرو۔ میں ان پے در پے حملوں سے نڈھال ہو رہا تھا کہ اس نے ہمیشہ کی طرح مجھے سنبھال لیا۔ اس نے کہا نہیں یہ غلط ہے تمھارے بعد یہ سلسلہ باقی رہے گا، ضرور کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو اس امانت کے امین ہوں گے، جو اس دردِ سر کو اپنے سر لے لیں گے۔ مگر پھر مجھے وہ کب یہاں گھسیٹ کر لے آئی۔ کب کیسے؟ بوڑھا ہانپ رہا تھا اور اس کا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس بوڑھے کی آنکھ بچا کر یہاں سے چل دوں۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

اس نے چھاگل سے پانی پیا تو بوڑھے نے کہا:

میاں صاحبزادے چند قطرے مجھے بھی۔

اس نے بوڑھے کے حلق میں پانی ڈالا، کچھ اس کے منہ میں گیا اور کچھ اِدھر اُدھر بہہ کر اس کی گرد آلود گردن میں چند لکیریں بنا کر جذب ہو گیا، اور پھر اپنا سامان اٹھا کر اس نے تیز تیز قدم بڑھائے۔

بوڑھا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔ اسے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ خواہ مخواہ یہ مصیبت گلے پڑی۔

میں نے اس صحرا کو پار کر لیا نا؟ کیوں میاں صاحبزادے۔ میں نہ کہتا تھا کہ میں اس صحرا سے نکل آؤں گا۔ وہ رک گیا۔ اس کا دل بوڑھے میں پڑا ہوا تھا۔

میاں صاحبزادے بولو نا! تم چپ کیوں ہو اور وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اور اس کے پاس آ کر بولا۔ بڑے میاں آپ آبادی میں آ گئے ہیں، صحرا سے نکل آئے ہیں۔ ہاں آں۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ کس قدر چہل پہل ہے۔ یہ بھی ہیں وہ بھی ہیں اور تم بھی ہو۔ تم سب وہی کہہ رہے ہو نا جو میں سن رہا ہوں۔ میں تنہا تو نہیں ہوں نا! نہیں بالکل نہیں۔ آبادی.....ویرانے.....چراغ.....اور بوڑھے

کی سانس اکھڑنے لگی۔ ہاں بڑے میاں ہم سب وہی کہہ رہے ہیں جو آپ سن رہے ہیں۔ ہم آپ کی طرح ویرانوں کو آباد کریں۔ اندھیرے راستوں کو روشن کریں گے۔ اب بوڑھے کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اب وہ پرسکون تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور یقین کے رنگ کھیل رہے تھے۔ مرنے کے بعد بھی۔ اور کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا وہ آبادی میں جا کر بوڑھے کا یہ پیام لوگوں تک پہنچائے!

کیا لوگ اس کی بات کو سنیں گے؟

اونہہ.....یہی کیا کم ہے کہ بوڑھا اس کی وجہ سے سکون سے مر سکا۔

ارے کتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔ وہ تیزی سے آبادی کی طرف بڑھنے لگا۔ آبادی جہاں اس کا آرام دہ گھر تھا، جہاں سکون تھا، عافیت تھی، آرام تھا اور جہاں بیٹھ کر وہ اپنے لیے مزید آرام کی تدبیریں سوچ سکتا تھا۔ مگر.....آبادی ویرانے .....نئی شاہراہیں اور .....وہ بوڑھا.....

.....

م ن سعید

کعبہ مرے پیچھے

اما پتی سخت اضطراب سے دوچار تھا۔ وہ گیارہ بجے بتی گل کر کے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ اب دو بج رہے تھے۔ اس دوران وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ آج مختصر وقت کے لئے بھی سو سکے گا۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ بستر سے اتر آیا۔ بتی جلائی۔ میز پر رکھی ہوئی بوتل سے منہ لگا کر پانی پیا۔ پانی پینے کے بعد یوں ہی خالی الذہن کھڑا رہا۔ خیالات کی یلغار نے اُسے تھکا دیا تھا۔ اُس نے بستر کی طرف دیکھا لیکن اُسے لیٹ جانے کی ذرہ بھر خواہش نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ بتی گل کی اور کونے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

پچھلی صبح اس کے لئے بری خبر لائی تھی۔ یوں تو اس نے عرصہ ہوا، تفصیل سے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا تھا، شہ سرخی دیکھ لی، اِدھر اُدھر سے صفحات پلٹے، دو ایک تصویریں دیکھ لیں اور اخبار رکھ دیا۔ اسے نہ سیاسی خبروں سے دل چسپی تھی نہ قتل و تشدد یا اور جرائم کی خبروں سے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں اس کے فکرمند ہونے نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔

صبح برآمدے میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے ایک تصویر پر اُس کی اُچٹتی سی نظر پڑی تھی۔ ایک نوجوان لڑکے کی لاش چھت سے جھول رہی تھی۔ انجینئرنگ کے آخری سال کا طالب علم تھا اور ناکامی برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کر لی تھی۔ اُما پتی چونکا۔ اس نے عجلت میں خبر پڑھی۔ پھر اس کے ٹھنڈا پسینہ چھوٹ نکلا۔ اس امتحان کے پرچوں کی جانچ کا کام اُسی کے سپرد تھا۔ نتائج کا اعلان کل ہی ہوا تھا۔ کمزور قوتِ ارادی کے طلبہ کی خودکشیاں نئی بات نہ تھی۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ طلب علم ہمیشہ درجہ اول میں کامیاب ہوتا رہا تھا۔ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ پرچوں کی جانچ غیر ذمے داری سے کی گئی ہوگی۔ اب اُس سے پوچھ تاچھ ہوگی۔

اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ ہتھے کا سہارا لے کر کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔ یونیورسٹی میں اُس کا نام اچھا تھا۔ اُس کے حسنِ انتظام کی وجہ سے یونیورسٹی پانچ سال سے برابر اُسے پرچوں کی جانچ کا نگران کار مقرر کر رہی تھی۔ اُس نے ذہن پر بہت زور دیا۔ خودکشی کا ارتکاب کرنے والے طالب علم سُریش کا اُس کے پاس کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے پرچے واقعی اچھے نہ کئے ہوں۔ اس خیال سے اُس کا اضطراب کم نہ ہوا۔ اُسے بہت جلدی میں اپنے دفاع کی تیاری کرنی تھی۔ وہ اُٹھا۔ عجلت میں تیار ہوا، اور یونٹ کو جانے کے لئے باہر نکلا۔ اُس کی بیوی ناشتے کے لئے اُسے آواز دیتی ہی رہ گئی لیکن وہ تیزی سے نکلا چلا گیا۔

دفتر کھلنے میں ابھی ایک گھنٹے کی دیر تھی۔ اُس نے اپنا یونٹ کھولا۔ رجسٹر میں سُریش کا حوالہ ڈھونڈ نکالا۔ پرچوں کا پیکٹ تلاش کیا۔ سُریش کے پرچے برآمد کئے۔ دونوں پرچوں میں سُریش نے درجہ اول کے مارکس حاصل کئے تھے۔ لیکن رجسٹر میں اندراج کے دوران اس کے مارکس فہرست کے اگلے طالب علم کے کھاتے میں درج ہو گئے تھے۔ اب اُسے یاد آیا۔ سُشیل نے اُسے دو پرچوں کے بیس ہزار روپے ادا کئے تھے۔ پرچوں کا ممتحن ایک سینیئر پروفیسر تھا۔ سُشیل کے پرچوں کو کامیابی کے مارکس دینے پر راضی نہ ہوسکتا تھا۔ چناں چہ اُما پتی کے اشارے پر رجسٹر میں اندراج کے دوران مارکس بدل دیئے گئے تھے۔ نئی بات نہ تھی۔ اس ہیر پھیر کے شکار اکثر طالب علم ممتحنوں کی لاپرواہی یا اپنے مقدر کو کوستے ہوئے دوبارہ امتحان لکھ دیتے تھے لیکن سُریش کی خودکشی نے معاملے کو سنگین بنا دیا تھا۔

اُما پتی نے کنٹرولر سے ملاقات کی۔ اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ صاف صاف خطائے بشری (human error) کا کیس تھا۔ ضابطے کے مطابق نیا بولیٹر پر دو غلطیوں کا جرمانہ ایک سو روپے عائد کرنے اور ٹیابولیشن کے کام سے دو باریوں کے لئے معطل کرنے کا فیصلہ ہوا۔

اُما پتی نے معاملہ رفع دفع تو کرا دیا تھا لیکن اُس کے باطن میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ نالائق طلبہ کو پاس کرا دینا اور بات تھی۔ ایک غریب، ذہین اور درجہ اول کے طالب علم کو ناکام کر کے خودکشی پر مجبور کر دینا دوسری بات تھی۔ سُریش کے نادار والدین نے اُسے اس منزل تک پہنچانے میں کیسی کیسی قربانیاں نہ دی ہوں گی۔ مستقبل کے کیسے کیسے سہانے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔ ان کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ اُس کے قلم نے کس سہولت کے ساتھ سُریش کی تقدیر سُشیل کے نام لکھ دی تھی۔ وہ خود نچلے طبقے کا فرد تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ نے کن مشکلات سے اُسے اس قابل بنایا تھا۔ اگر یہی واقعہ اس کے ساتھ ہوا ہوتا تو اس کا پورا گھر تباہ ہو چکا ہوتا۔

وہ شدید اندرونی اضطراب سے دوچار تھا۔ یہ کیسا ہیومن ایرّر تھا کہ جس کی قیمت کسی کو اپنی جان سے چکانی پڑی اور اس کی جان کا معاوضہ صرف سو روپئے لگایا گیا۔ اور یہ حقیر سو روپئے بھی اُن کو ادا نہیں کئے گئے جنہوں نے اپنے لختِ جگر کو کھو دیا بلکہ کوئی اور لے گیا۔ اور خود اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ امتحانات کے بازار میں چورا ہے پر کھڑا اپنی بولی آپ لگا رہا ہے۔ ہر وہ امیر زادہ جس کی جیب گرم ہے، چند نوٹ دکھا کر اُسے خرید سکتا ہے۔ اور وہ ایک فاحشہ کی طرح بکنے کے لئے تیار ہے۔ کس لئے؟ زندگی کی چند افزود آسائشوں کے لئے جن کی حیثیت محض اضافی ہے۔ آدمی کی حرص کی کوئی حد ہے؟ اس نے گزشتہ پانچ سالوں میں تقریباً ہر حسرت پوری کر لی تھی۔ پھر اس لوٹ کو جاری رکھنے سے کیا حاصل؟

اپنے اندرونی ہیجان سے نبرد آزما ہونے کے لئے اُسے کسی سہارے کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے اندر ہی اندر اندیشوں نے گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے خوف آنے لگا تھا کہ سُریش کے ماں باپ کی آہیں کہیں اسے اپنی لپیٹ میں نہ لے لیں۔ ایک بار کو اس کے دل میں آئی کہ ان سے ملاقات کرے اور کچھ نہ کچھ مالی امداد کر دے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس میں بڑے خطرات مضمر ہیں۔ بات کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے۔ اس وقت human error سے بہتر تحفظ کسی اور تدبیر میں نہیں۔

لیکن وہ اپنے دل کی خلش کو کیا کرے۔ شب کی آخری ساعتوں میں کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سات بجے تک کرسی پر ہی پڑا رہا۔ پانچ بجے اُٹھ جانا اس کا معمول تھا۔ سات بجے تک دیکھ کر اس کی بیوی نے اُسے جگایا۔ اس کے چہرے پر شدید تھکاوٹ کے آثار دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ آپ نے کرسی پر رات گزار دی؟ پریشان لگ رہے ہیں۔ بات کیا ہے؟''

''گنگا مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ ہاں میں پریشان ہوں۔ ذرا باتھ روم ہو آؤں۔ پھر بات کروں گا۔''

گنگا فکر مند سی ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو ایسا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ ''منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ تب تک کافی تیار کر لوں گی۔''

ناشتے کی میز پر اُما پتی نے کہا۔

''گنگا ایک واقعہ ہو گیا ہے۔ میں جس امتحان کا نگران کار ہوں، اس کے ایک اسٹوڈنٹ نے کل خودکشی کر لی۔ تب سے میرا سکون چھن گیا ہے۔''

''مگر اس کے لئے آپ کیسے ذمے دار ہیں؟''

''ذمہ دار میں ہی ہوں۔ وہ فرسٹ کلاس اسٹوڈنٹ تھا۔ میں نے مارکس بدلوا دیئے۔ غریب تھا۔ فیل ہونے کو برداشت نہ کر سکا۔ خودکشی کر لی۔''

گنگا کی زبان سے بات نہیں نکلی۔

''ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سے پہلے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ میں جو کر رہا ہوں وہ کتنا درست ہے اور کتنا غلط۔''

گنگا نے کچھ نہیں کہا۔

''میں رات بھر بے چین رہا۔ سو نہ سکا۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کی کیا حالت ہو گی۔ میں بہت مجرم محسوس کر رہا ہوں۔''

گنگا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بولی۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔ پر جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب پچھتانے سے تو وہ واپس نہ آئے گا۔''

''لیکن جو پاپ مجھ سے ہوا ہے، اس کا بوجھ بہت بھاری ہے۔''

تھوڑی دیر توقف رہا۔ پھر گنگا نے آہستہ سے کہا۔

''پاپ کا پرائشچت بھی تو ممکن ہے۔''

''پرائشچت سے کیا وہ واپس آ جائے گا۔''

''نہیں آئے گا لیکن پرائشچت دوش سے بچنے کا راستہ دکھاتا ہے۔''

''ہاں'' اُما پتی نے آہستہ سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''تمہارے خیال میں اب کیا کریں؟''

''تم مانو تو ہم تروپتی جائیں گے۔ پچیس ہزار کا بڑا پوجا کرائیں گے۔ اگر تم ٹھیک سمجھو تو پچاس ہزار ہانڈی میں ڈال دیں گے۔''

سات پہاڑوں کے آقا سری وینکٹیشورا کی بارگاہ میں پچیس ہزار روپیوں کی خصوصی پوجا کے توسط سے خصوصی باریابی اور درشن کے بعد اُما پتی کے دل کا بوجھ بڑی حد تک ہٹ گیا۔ اُس نے پچاس ہزار ہُنڈی میں بھی ڈال دیئے تھے۔ وہ تروپتی کی مقدس فضاؤں سے باہر نکلا تو محسوس کر رہا تھا کہ وہ جن آلائشوں میں لتھڑ گیا تھا، وہ اس کے وجود سے ڈھل گئی ہیں اور وہ شفاف ہو گیا ہے۔ اگر پرماتما کا وجود نہ ہوتا تو بھٹکی ہوئی ڈگر سے ہدایت کی تلاش میں وہ کس کے پاس جاتا۔ اُسے ایک عجیب سی تازگی اور شفافیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے درشن کے دوران ہاتھ جوڑ کر آقائے ہفت کوہ کی بارگاہ میں دل سے سوگند کھائی کہ وہ اس کام سے اب ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جائے گا۔ اس نے بڑی شردھّا کے ساتھ پرارتھنا کی کہ آقائے ہفت کوہ اس کے فیصلے کی حفاظت فرمائے اور اسے اس پر قائم رہنے کی شکتی دے۔

شہر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ کار چلاتے چلاتے وہ کافی تھک گیا تھا۔ اس نے گھر کے سامنے کار روکی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ کوئی لڑکا باہر اس کا منتظر ہے۔ کچھ سمٹتے سمٹتے اس نے قریب آ کر اسے پرنام کیا۔

اُما پتی نے پوچھا۔ ''مجھ سے ملنا ہے؟''

''جی سر''

''اچھا، دو منٹ۔ گاڑی اندر کر لوں۔''

اس نے پورچ میں گاڑی کھڑی کی۔ گنگا نے اس دوران اُتر کر برآمدے کی بتی روشن کر دی تھی۔ اُما پتی نے لڑکے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اس نے پوچھا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''ناگراج سر''

''اتنی رات گئے کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''سر مجھے سُشیل نے بھیجا ہے۔''

اُما پتی کے چہرے کی رگیں تن گئیں۔اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کہیں آگ سی لگ گئی ہو۔اس نے ناگراج کو خشمگیں نظروں سے دیکھا۔بے قابو ہوتے ہوئے غصے کی ایک تیز لہر اس کے اندر سے طوفان بن کر نکلی اور اس کے چہرے پر چھا گئی۔اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔بڑی مشکل سے اپنے اشتعال کو ضبط کرتے ہوئے وہ ناگراج کو دیکھے گیا۔

''سر!اپچاس کیس ہیں۔فی کیس میں ہزار۔آدھی اماؤنٹ لایا ہوں۔ابھی اور کیس بھی ملیں گے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟'' وہ ایک دم بگڑ گیا۔

''سر،وہ۔۔۔''

''میں نہیں جانتا کسی سشیل کو۔نکل جاؤ ابھی پھر کبھی قدم نہ رکھنا۔۔۔'' وہ بھڑک اٹھا

''سر،مگر۔۔۔''

''آؤٹ یو،گو۔دِس مومنٹ!جسٹ گیٹ آؤٹ۔اینڈ ڈونٹ شو یور فیس اگین۔'' اس کی آواز ایک دم بلند ہوگئی۔

ناگراج کچھ ہکا بکا سا ہوگیا تھا۔اس نے بیگ سنبھالا اور سراسیمہ ہوکر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اُما پتی کہتے کہتے کھڑا ہوگیا تھا۔غصے کی شدت سے اس کا بدن لرز رہا تھا۔لڑکے کے نکل جانے کے بعد اس نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ قابو میں کیا۔اُسے ایک طرح کی ذلت کا احساس ہو رہا تھا۔ہر سڑک چھاپ بیگ اٹھائے اُسے خریدنے چلا آتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ اُسے اندر ہی اندر ایک سکون بھری ٹھنڈک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔یعنی ترو پتی میں کئے ہوئے عہد کی پاس داری میں میں نے بے جھجک پانچ لاکھ کی رقم ٹھکرادی۔میں ایسا کرسکتا ہوں!یہ میرے لئے ممکن ہوگیا!اس انکشاف سے وہ ایک عجیب اندرونی مسرت سے سرشار ہو رہا تھا۔اس دوران گنگا باہر آگئی تھی۔اس نے گنگا کو دیکھا۔ہولے سے مسکرایا۔جواب میں گنگا کی مسکراہٹ روشن بھی تھی اور اس کے چہرے پر تعریف کا آسودگی بھرا تاثر بھی۔

کالج کا کام نمٹا کر اُما پتی یونٹ پہنچا۔رات ہی سے وہ ایک عجیب سرشاری کی کیفیت میں تھا اور بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ بچا ہوا کام جلد از جلد ختم کر کے ضروری کاغذات دفتر کو سونپ دے اور اس گھناؤنے کام سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرلے۔

نئے پرچوں کی جانچ کا کام بس شروع ہونے ہی والا تھا۔اس نے اپنے معاون کو بلا کر کہا۔

''مجھے ایک اسائنمنٹ مل گیا ہے۔پورا وقت دینا پڑے گا۔ویالیوئیشن کے لئے وقت دینا ممکن نہ ہوگا۔گزشتہ امتحان کے ضروری کاغذات اور رپورٹ تیار کردو۔اس ویالیوئیشن کی ذمہ داری تمہیں سونپنے کے بارے میں کنٹرولر سے بات کرلوں گا۔''

معاون کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اُما پتی کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔گنگا کا فون تھا۔

''ایک بڑی خوش خبری ہے۔''اس کے لہجے میں مسرت بھرا جوش تھا۔

''پہلے مبارک قبول کرلو۔اوراب بتاؤ،خوش خبری کیا ہے۔''

''گاندھی نگر کے پاش لے آؤٹ میں ہمیں بڑا پلاٹ الاٹ ہوگیا ہے۔''

''بھئی واہ!۔۔۔''

''بیلینس کی ادائیگی تین ہفتوں کے اندر اندر کردینی چاہیئے ورنہ الاٹمنٹ کینسل ہوجائے گا۔''

''اوہو!شاید بارہ لاکھ بھرنے ہیں۔''

"ہاں"

کہاں سے لائیں گے اتنی بڑی اماؤنٹ۔۔۔''

''ایسا موقع پھر نہیں آئے گا۔دو ایک سال میں پلاٹ ایک کروڑ کا ہوجائے گا۔''

''بھول جاؤ گنگا۔شاید یہ پلاٹ ہمارے بھاگ میں نہیں ہے۔''

گنگا کی آواز نہ آئی۔

''گنگا۔''

دوسری طرف مکمل سکوت تھا۔

''گنگا سُن رہی ہو۔''

دوسری طرف بھاری سناٹا تھا۔

اُما پتی نے فون بند کردیا۔

سناٹا اس کے اطراف بھی بہت پھیل گیا تھا۔بہت گہرا سنّاٹا۔بہت اندھیرا،بہت مہیب سا سناٹا۔یہ بھیانک سناٹا اس کے گھر کے درودیوار سے بھی اُگنے والا تھا۔سیاہ غلاف بن کر اس کے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا۔گنگا نے کب سے بڑے پلاٹ کا خواب دیکھا تھا۔سارا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔اس کے تصور میں بس گیا تھا۔مکان کسی گوشے میں ہوگا۔لان کہاں ہوگی۔چھوٹا سا حوض کدھر ہوگا۔گرین ہاؤز کس حصے میں ہوگا۔پھلوں کے درختوں کی قطاریں کس دیوار سے لگی ہوں گی۔جھولے کدھر پڑے ہوں گے۔پلاٹ کے ایک حصے میں کمرشیل عمارت بنادی جائے تو ماہانہ کم از کم پچاس ہزار روپیے کی آمدنی کا مستقل ذریعہ نکل آئے گا۔صرف تنخواہ پر دارومدار ہوتو بڑھتے ہوئے گھر کی ضرورتوں کو کیسا اور کب تک پورا کیا جاسکے گا۔قسمت نے ایک موقع دے دیا ہے ورنہ بڑے بڑے وزیر،بڑے بڑے

کاروباری اس الاٹمنٹ کے لئے لائن لگائے کھڑے تھے۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ایک ہولناک سناٹا اس کے گھر میں سائیں سائیں کرے گا۔ ایک مستقل عذاب کے منحوس سائے گھر کا امن وسکون چھین لیں گے۔ گھر میں اس کی گنگا، پرچھائیں بن کر رہ جائے گی۔ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن لاکھوں کی رقم کہاں سے لائیں گے۔

بھگوان یہ کیسی پریکشا ہے۔ ابھی کل تک میں کیسے اندھیروں میں گھرا ہوا تھا۔ تیری کرپا سے جوت ملی۔ لیکن اس جوت کا پورا لابھ اُٹھا بھی نہیں پایا تھا کہ نئے اندھیرے منہ پھاڑے اُسے نگلنے کے لئے چلے آرہے ہیں۔ میں ایک دُربل منشیہ ہوں اور تو بلوان ہے۔ مجھے اس پریکشا سے کامیاب نکلنے کی آتما شکتی دے۔

وہ بڑی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ ایک طوفان تھا جو اس کے اندرون میں اُٹھ رہا تھا۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ لکشمی دیوی سویم اس کے دوار پر دستک دے رہی ہے۔ اسے نہ سویکار کروں تو دیوی ماں کا اکمان بھی ہوگا اور اس کا کرودھ بھی اُٹھانا ہوگا۔ شاید ہمیشہ کے لئے۔ دیوی نے کرپا کی درُشٹی سے دیکھا ہے۔ شاید انہیں میرا پرائشچت سویکار ہو گیا ہے اور وہ پرسنّ ہو کر مجھے وردان دینا چاہتی ہیں۔ ورنہ میں، کالج کا ایک سادھارن لکچرر، جیؤن کی پوری پونجی بھی لگا دوں تو اتنا روپیہ جٹا نہ پاؤں۔ مگر پرائشچت اپنے آپ میں تو کوئی پُنیہ نہیں ہے۔ وہ تو دوش سے بچنے کا راستہ ہے۔ لیکن اگر یہ اندھیرا ہی ہے اور میرے بھاگیہ میں لکھ ہی دیا گیا ہے تو مجھ میں اتنی شکتی کہاں کہ اُسے مٹا سکوں۔ میں تو ایک دُربل سادھارن منشیہ ہوں اور پرماتما! تیری کرپا انت ہے۔ پاپیوں کو شما کرنا تیرا دھرم ہے۔ شاید ایک اور پرائشچت کرنے کے لئے تیرے چرنوں میں پھر اُپستِت ہونے کا سمّان میرے بھاگیہ میں لکھ دیا گیا ہے۔

فون پر اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔ آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑنے لگی۔ پھر اس نے بہت ٹھہر ٹھہر کر نمبر ڈائل کئے۔

''ہیلو سُشیل میں اُما پتی بول رہا ہوں۔ ناگراج کو بھیج دو۔''

عبدالصمد

شہر بند

آنکھوں اور کانوں کے ذریعے اندر تک پہنچنے والی ساری خبریں اس بات پر زور دے رہی تھیں کہ اب کے سیاسی جماعتوں کی طرف سے جو مظاہرہ ہونے والا ہے، وہ اتنا بڑا، اتنا شاندار ہوگا کہ شہر کے سارے راستے بند ہو جائیں گے اور زندگی اپاہج بن کر رہ جائے گی۔ ان خبروں میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی ایسی خبریں سنتے رہے تھے۔ دراصل فساد، بیکاری اور دولت کی غلط تقسیم نیز اُس کے غلط استعمال پر باتیں کر کر کے وہ تھک چکے تھے۔ اگر ان مسئلوں کے حل ہونے کی کچھ امید پیدا ہوتی تب پھر نئے موضوعات پر باتوں کا شاید ایک دراز سلسلہ چل پڑتا۔ لیکن وہاں تو کچھ نہیں تھا، ان باتوں کے سوا، سو باتیں نا کردہ گناہوں کے بوجھ کی طرح لوگوں پر سوار ہو گئی تھیں۔ لوگ اس بوجھ کو اٹھائے بولائے بولائے پھرتے، محض اس امید پر کہ شاید انھیں اس بوجھ کو اتار پھینکنے کا موقع مل جائے اور وہ چین کی سانس لے سکیں۔ اگر یہ امید ان کے روبہ رو نہ ہوتی تو اب تک وہ اس بوجھ تلے دب چکے ہوتے۔ چنانچہ جب اُنھیں ہر چہار طرف سے خبریں ملنے لگیں کہ اب شہر بند ہو جائے گا تو وہ بڑے خوش ہوئے کہ اور کچھ نہ ہو، نئی بات تو نکلی اور موضوع تو بدلا۔

اس کے بعد ان کی نگاہیں، اُن حدوں پر جا کر ٹھہر جاتیں، جہاں انھیں نظر آتا کہ جب شہر بند ہوگا تو خرید و فروخت کے ذرائع بھی بند ہوں گے، جس کے نتیجے میں قیاس آرائیوں کا ایک اٹھتا ہوا طوفان دکھائی دیتا۔ اس مجوزہ خطرے کے پیش نظر بازاروں میں جو رونق اور سجاوٹ دکھائی دی، اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ عرصے کے بعد دوکانداروں کے چہرے پر اتنی چہل پہل نظر آئی تھی۔ ورنہ وہ تہواروں اور عام دنوں میں فرق سمجھنا بھول چکے تھے۔ یوں بازار کے اپنے اصول متعین تھے اور سیاسی، معاشی نقطۂ نگاہ سے آبادی کی تقسیم کا نقشہ کچھ بھی ہو، بازار نے انھیں خانوں میں اس طرح منقسم کر رکھا تھا کہ پہلے خانے میں، جو مہینے کے پہلے ہفتے میں پڑتا، دفتروں میں کام کرنے والے آتے، ہفتے کے پہلے دن، کل کارخانوں میں کام کرنے والے، دوسرے ہفتے میں وہ پیشہ ور، جو مہینے کے پہلے ہفتے کی بھیڑ بھاڑ سے گھبراتے تھے، بقیہ دن ..... بلکہ سبھی دن۔ .....ان لوگوں کے تھے جن پر کسی متعین اصول کی پابندی عائد نہیں ہوتی تھی، وہ تقسیم کے زمرے میں آتے ہوں یا نہیں، وہ اپنے آپ کو کسی خانے میں رکھنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔

اب گلی کے ہر نکڑ اور سڑک کے ہر موڑ پر جو باتیں ہوتیں، ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح مجوزہ دن سے ہوتا۔ لوگ جوش و خروش میں اپنے اوپر لادے ہوئے بوجھ کو بھی بھلا گئے تھے۔ انھیں یہ احساس چھو بھی نہیں رہا تھا کہ کہیں ان کے بوجھ میں کچھ اضافہ تو نہیں ہو رہا۔ وہ جس انداز میں باتیں کرتے، اس سے پتہ چلتا کہ اس دن کہیں باہر سے کچھ لوگ شہر میں آ کر مظاہرہ کریں گے اور بند کرائیں گے، ان کی

حیثیت تو محض تماشائی کی ہوگی۔ اتفاق یہ کہ واقعہ بھی یہی تھا۔ ان کی حیثیت تماشائی سے زیادہ ہوتی بھی نہیں تھی۔ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ جب کوئی ایسا دن طے ہوتا تو شہر میں ٹرکوں ٹرک آدمی، باہر سے آتے، میلے ٹھیلے کی ایک کیفیت پیدا ہوتی، یہ لوگ مظاہرہ کرتے، جلوس نکالتے، دوکانوں کو بند کراتے، ضرورت پڑے تو گولیاں کھاتے، لاٹھیاں کھاتے ---------- پھر شہر میں قبرستان کی سی خاموشی چھا جاتی۔ اس خاموشی کے فوراً بعد جو زندگی شروع ہوتی، اس میں رتی برابر بھی نیا پن نہیں ہوتا۔ لوگ مظاہرے، جلوس، بند، گولیوں اور لاٹھیوں کو یکسر بھلا دیتے اور اس کھیل میں پھر انہماک کے ساتھ لگ جاتے جس میں زندگی کبھی ان پر سوار ہونے کی کوشش کرتی اور وہ زندگی پر۔

بارے، وہ دن آ پہنچا تو سب کچھ وہی ہوا جو اب تک ہوتا آیا تھا۔ باہر سے لوگ آئے اور پھیل گئے۔ شہر کے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے تھے کہ کون سی سڑک اور کون سی گلی میں اب کتنی بھیڑ ہے اور جلوس اب کدھر سے گزر رہا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے موقع پر، آندھی ہو، طوفان ہو، مظاہرہ ہو، بند ہو..... یہ وطیرہ اختیار کرتے وہ آنکھوں دیکھی نہیں، کانوں سنی ہوتا۔ اصل میں وہ جانتے بھی نہیں تھے کہ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ نہ تو کسی نے آ کر انھیں کچھ بتایا، نہ کبھی انھوں نے جاننے کی جستجو کی۔ انھیں تو بس بند ہو کر بیٹھ جانے ہی میں اپنی نجات دکھائی پڑتی۔ یوں تجسس کی شکل میں انھیں ایک ایسی بیش بہا دولت ہاتھ آتی کہ پھر وہ اپنی محرومیوں اور مصیبتوں کو بالکل بھول جاتے۔ تب انھیں کوئی بتاتا کہ جلوس اب سڑک نمبر ایک پر گزر رہا ہے اور اُس طرف کی سب راہیں بند ہو چکی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد تجسس پھر انھیں اکساتا تو انھیں خبر ملتی کہ جلوس اب سڑک نمبر دو پر ہے اور وہاں کے سب راستے بند۔ کبھی انہیں معلوم ہوتا کہ جلوس اتنا بڑا ہے کہ اس کا ایک سرا سڑک نمبر تین پر ہے تو دوسرا سڑک نمبر چھ پر۔ کبھی انہیں یہ اطلاع ملتی کہ جلوس میں اتنا جوش و خروش اور اس قدر نعرہ بازی ہے کہ کسی وقت بھی جلوس تشدد پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ انھیں پتہ چلا کہ جلوس کے ایک حصے پر پولس نے لاٹھی چارج کیا جس کی وجہ کر بہت اشتعال پھیل گیا۔ کچھ سرکاری عمارتوں پر پتھر بازی بھی ہوئی لیکن حکام اور لیڈروں کی بروقت کارروائی اور تعاون سے ہنگامہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ سب باتیں ان کی عین توقع کے مطابق ہو رہی تھیں۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تیاری اور بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے باوجود گھروں میں بند نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی ہنگامی ضرورتیں تھیں جو ان کے پاؤں سے لپٹ گئی تھیں اور وہ ان کے اشارے پر ناچنے پر مجبور تھے۔ کچھ لوگوں کا محبوب سے ملنے کا وعدہ تھا اور انھوں نے دل میں ارادہ باندھ رکھا تھا کہ آگ کے دریا سے گزر کر بھی در محبوب کو جانا پڑا تو جائیں گے ضرور۔ کچھ لوگ کھلی ہوا اور کھلی فضا میں سانس لینے کے عادی تھے، وہ اگر اس حبس میں زیادہ دیر بند رہ جاتے تو ان کی سانسیں گھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ ایک طرف وہ تھے، دوسری طرف آنے والی خبریں جو بار بار تصدیق کر رہی تھیں کہ شہر کے سبھی راستے بند ہو چکے ہیں اور کوئی کھلی راہ باقی نہیں۔ لیکن ضرورتوں کے شہ زور سانپ کسی طرح سن ہی نہیں رہے تھے، انھیں ایک طرف دبایا جاتا تو دوسری طرف کو پھن کاڑھ کر کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ سانپ نے پھنکار مار مار کر انھیں باہر نکالا۔ جن لوگوں نے محبوب سے وعدے کر رکھے تھے، اُن

کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ مَرے تو شہید اور بچ گئے تو غازی۔ وعدہ تو انھیں پورا کرنا ہی تھا ورنہ رواداری پر بھی زبردست آنچ آتی، چنانچہ وہ بھی نکلے۔ رہ گئے، کھلی فضاؤں میں سانس لینے والے تو وہ اس وقت تک نچلے بیٹھے رہے جب تک برداشت کی لگام ہاتھوں میں رہی۔ جب لگام چھوٹ گئی تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ باقی ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے آپ کو بند نہیں رکھیں۔

یہاں پر اس کی وضاحت ضروری ہے کہ تینوں الگ الگ اپنی راہوں میں نکلے تھے اور یکجا ہرگز نہیں تھے، وہ تو راوی ہے جس نے انھیں یکجا دیکھا اور لکھا۔

اب ہوا یوں کہ ضرورت والے اپنی راہ میں آگے بڑھتے ہی گئے۔ درمحبوب کو جانے والوں کے قدم کسی نے نہیں روکے اور کھلی فضاؤں میں سانس لینے والے تازہ دم ہوکر لوٹ بھی آئے تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا کہ آخر یہ کیوں کر ہوا۔ انھوں نے تو کسی خطرے کے پیش نظر اپنے آپ کو بند کیا تھا اور ہمیشہ بند کرتے آئے تھے کہ نجات کا یہ سب سے آسان طریقہ انھوں نے ایجاد کر رکھا تھا، ان کے ایمان کی ساری بنیاد کانوں سنی باتوں پر استوار ہوتی۔ اب جو آنکھوں دیکھی بالکل مختلف باتیں ان تک پہنچیں تو انھیں دھکا سا لگا۔ تصویر کا وہ تانا بانا ہی ٹوٹ گیا جو وہ اب تک بنتے رہے تھے۔ وہ دیر تک اس دھکے کے زیر اثر رہے۔

اب تک وہ یہ سمجھتے رہے تھے کہ اپنے آپ کو بند کر کے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بھرے ہیں، لیکن کھلنے پر ان کے دونوں ہاتھ خالی کے خالی نکلے۔ یہ خالی ہاتھ ان کے وجود کے چاروں طرف حصار ڈال رہے تھے اور قریب تھا کہ ان میں ان کا وجود گھس جاتا کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو یہ یقین دلایا کہ اب تک وہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گھپلے کا شکار ہوتے رہے ہیں ورنہ انھوں نے ہمیشہ صراط مستقیم کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، انجانے کا حال خدا کو معلوم۔

شاید انھیں ان راستوں کی خبر ہی نہیں تھی جو سدا کھلے رہ جاتے تھے یا پھر وہ راستے جو بند ہی رہا کرتے۔ رہی شہر بند ہونے کی بات تو اس سے صورتِ حال میں کیا تبدیلی آسکتی ہے۔

علی سردار جعفری

آزادی

پوچھتا ہے تو کہ کب اور کس طرح آتی ہوں میں
گود میں ناکامیوں کے پرورش پاتی ہوں میں

صرف وہ مخصوص سینے ہیں مری آرام گاہ
آرزو کی طرح رہ جاتی ہے جن میں گھٹ کے آہ

اہل غم کے ساتھ ان کا درد و غم سہتی ہوں میں
کانپتے ہونٹوں پہ بن کر بددعا رہتی ہوں میں

رقص کرتی ہیں اشاروں پر مرے موت و حیات
دیکھتی رہتی ہوں میں ہر وقت نبض کائنات

خود فریبی بڑھ کے جب بنتی ہے احساس شعور
جب جواں ہوتا ہے اہل زر کے تیور میں غرور

مفلسی سے کرتے ہیں جب آدمیت کو جدا
جب لہو پیتے ہیں تہذیب و تمدن کے خدا

بھوت بن کر ناچتا ہے سر پہ جب قومی وقار
لے کے مذہب کی سپر آتا ہے جب سرمایہ دار

راستے جب بند ہوتے ہیں دعاؤں کے لئے
آدمی لڑتا ہے جب جھوٹے خداؤں کے لئے

زندگی انساں کی کر دیتا ہے جب انساں حرام
جب اسے قانون فطرت کا عطا ہوتا ہے نام

اہرمن پھرتا ہے جب اپنا دہن کھولے ہوئے
آسماں سے موت جب آتی ہے پر تولے ہوئے

جب کسانوں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے ہراس
پھوٹنے لگتی ہے جب مزدور کے زخموں سے یاس

صبر ایوبی کا جب لبریز ہوتا ہے سبو
سوز غم سے کھولتا ہے جب غلاموں کا لہو

غاصبوں سے بڑھ کے جب کرتا ہے حق اپنا سوال
جب نظر آتا ہے مظلوموں کے چہروں پر جلال

تفرقہ پڑتا ہے جب دنیا میں نسل و رنگ کا
لے کے میں آتی ہوں پرچم انقلاب و جنگ کا

ہاں مگر جب ٹوٹ جاتی ہے حوادث کی کمند
جب کچل دیتا ہے ہر شے کو بغاوت کا سمند

جب نگل لیتا ہے طوفاں بڑھ کے کشتی نوح کی
گھٹ کے جب انسان میں رہ جاتی ہے عظمت روح کی

دور ہو جاتی ہے جب مزدوروں کے دل کی جلن
جب تبسم بن کے ہونٹوں پر سمٹتی ہے تھکن

جب ابھرتا ہے افق سے زندگی کا ہے آفتاب
جب نکھرتا ہے لہو کی آگ میں تپ کر شباب

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب و رنگ
روند چکتی ہے جب ان سب کو جوانی کی امنگ

صبح کے زریں تبسم میں عیاں ہوتی ہوں میں
رفعت عرش بریں سے پرفشاں ہوتی ہوں میں

نوجوان سے

جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر
صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر
بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ
یہی ہے جان جہاں اس میں آب پیدا کر
ترے قدم پہ نظر آئے محفل انجم
وہ بانکپن وہ اچھوتا شباب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزار جہاں میں گلاب پیدا کر
سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر
نہ دیکھ زہد کی تو عصمت گنہ آلود
گنہ میں فطرت عصمت مآب پیدا کر
ترے جلو میں نئی جنتیں نئے دوزخ
نئی جزائیں انوکھے عذاب پیدا کر

شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
گرا دے قصر تمدن کہ اک فریب ہے یہ
اٹھا دے رسم محبت عذاب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
جو ہو سکے تو ہمارا جواب پید ا کر
بہے زمیں پہ جو میر الہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

سب مایا ہے

سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے، فیضؔ نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے

ہاں گاہے گاہے دید کی دولت ہاتھ آئی
یا ایک وہ لذت نام ہے جس کا رسوائی
بس اس کے سوا تو جو بھی ثواب کمایا ہے
سب مایا ہے

اک نام تو باقی رہتا ہے، گر جان نہیں
جب دیکھ لیا اس سودے میں نقصان نہیں
تب شمع پہ دینے جان پتنگا آیا ہے
سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصہ بھی
سب ایک سے ہیں، یہ رانجھا بھی یہ انشؔا بھی
فرہاد بھی جو اک نہر کی کھود کے لایا ہے
سب مایا ہے

کیوں درد کے نامے لکھتے لکھتے رات کرو
جس سات سمندر پار کی نار کی بات کرو
اس نار سے کوئی ایک نے دھوکا کھایا ہے؟
سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام لکھیں
تم جانتے ہو ہم کیوں کر اس کا نام لکھیں
دل اس کی بھی چوکھٹ چوم کے واپس آیا ہے
سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی رانی تھی
وہ جس کی الھڑ آنکھوں میں حیرانی تھی
آج اس نے بھی پیغام یہی بھجوایا ہے
سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں
ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے
سب مایا ہے
جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اس شہر سے دور اک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اور اس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے
سب مایا ہے

ہولی

ہوا جو آ کے نشاں آشکار ہولی کا
بجا رباب سے مل کر ستار ہولی کا
سرود رقص ہوا بے شمار ہولی کا
ہنسی خوشی میں بڑھا کاروبار ہولی کا
زباں پہ نام ہوا بار بار ہولی کا

خوشی کی دھوم سے ہر گھر میں رنگ بنوائے
گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھوائے
نشوں کے جوش ہوئے راگ رنگ ٹھہرائے
جھمکتے روپ کے بن بن کے سوانگ دکھلائے
ہوا ہجوم عجب ہر کنار ہولی کا

گلی میں کوچے میں غل شور ہو رہے اکثر
چھڑکنے رنگ لگے یار ہر گھڑی بھر بھر
بدن میں بھیگے ہیں کپڑے گلال چہروں پر
مچی یہ دھوم تو اپنے گھروں سے خوش ہو کر
تماشا دیکھنے نکلے نگار ہولی کا

بہار چھڑکواں کپڑوں کی جب نظر آئی
ہر عشق باز نے دل کی مراد بھر پائی
نگہ لڑا کے پکارا ہر ایک شیدائی
میاں یہ تم نے جو پوشاک اپنی دکھلائی
خوش آیا اب ہمیں نقش و نگار ہولی کا

تمہارے دیکھ کے منہ پر گلال کی لالی
ہمارے دل کو ہوئی ہر طرح کی خوشحالی
نگہ نے دی مئے گل رنگ کی بھری پیالی
جو ہنس کے دو ہمیں پیارے تم اس گھڑی گالی
تو ہم بھی جانیں کہ ایسا ہے پیار ہولی کا

جو کی ہے تم نے یہ ہولی کی طرفہ تیاری
تو ہنس کے دیکھو ادھر کو بھی جان یک باری
تمہاری آن بہت ہم کو لگتی ہے پیاری
لگا دو ہاتھ سے اپنے جو ایک پچکاری
تو ہم بھی دیکھیں بدن پر سنگار ہولی کا

تمہارے ملنے کا رکھ کر ہم اپنے دل میں دھیان
کھڑے ہیں آس لگا کر کہ دیکھ لیں اک آن
یہ خوش دلی کا جو ٹھہرا ہے آن کر سامان
گلے میں ڈال کے بانہیں خوشی سے تم اے جان
پہناؤ ہم کو بھی اک دم یہ ہار ہولی کا

ادھر سے رنگ لیے آؤ تم ادھر سے ہم
گلال عبیر ملیں منہ پہ ہو کے خوش ہر دم
خوشی سے بولیں ہنسیں ہولی کھیل کر باہم
بہت دنوں سے ہمیں تو تمہارے سر کی قسم
اسی امید میں تھا انتظار ہولی کا

بتوں کی گالیاں ہنس ہنس کے کوئی سہتا ہے
گلال پڑتا ہے کپڑوں سے رنگ بہتا ہے
لگا کے تاک کوئی منہ کو دیکھ رہتا ہے
نظیر یار سے اپنے کھڑا یہ کہتا ہے
مزا دکھا ہمیں کچھ تو بھی یار ہولی کا

مولوی عبدالحق

اسم اوراس کی قسمیں

اسم وہ لفظ ہے جو کسی کا نام ہو

اسم کی دو قسمیں ہیں

ا۔خاص ۲۔عام

خاص:

کسی شخص یا شئے یا مقام کا نام۔مثلاً علاءالدین،کلکتہ،گنگا

عام:

وہ اسم ہے جو ایک قسم کے تمام افراد کے لئے فرداً فرداً استعمال ہو سکے جیسے آدمی،گھوڑا،درخت،کتاب

اسم خاص:

اشخاص کے اسم خاص بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔مثلاً

ا۔خطاب: نام جو بادشاہ یا سرکار دربار سے اعزازی طور پر ملتا ہے۔اقبال الدولہ،عمادالملک۔

۲۔لقب: ایک وصفی نام جو کسی خصوصیت یا وصف کی وجہ سے پڑ گیا ہو۔جیسے مرزا نوشہ لقب ہے اسداللہ خاں غالب کا یا کلیم اللہ لقب ہے حضرت موسیٰ کا۔

۳۔عرف: وہ نام ہے جو محبت یا حقارت کی وجہ سے پڑ جائے یا اصل نام کا اختصار لوگوں کی زبان زد ہو جائے۔جیسے چٹو،کلن،فخرو،اچھے میاں

۴۔تخلص: ایک مختصر نام جو شاعر نظم میں بجائے اصلی نام کے داخل کر دیتے ہیں۔مثلاً غالبؔ تخلص ہے مرزا اسداللہ خاں کا۔حالیؔ تخلص ہے مولانا الطاف حسین کا۔

اس کے علاوہ ممالک،دریاؤں اور پہاڑوں کے اور دیگر جغرافیائی اسماء اور علم وفنون وامراض وغیرہ کے نام سب اسم خاص ہوں گے۔

بعض اوقات اسم خاص اسم کی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔جیسے رستم،حاتم وغیرہ مثلاً یوں کہیں کہ وہ شخص اپنے وقت کا حاتم ہے۔یا وہ رستم ہند ہے یا فلاں شخص قیس یا فریاد ہے۔یا وہ سعدی یا کالیداس ہے۔ایسے موقعوں پر رستم سے بڑا پہلوان،حاتم سے بڑا سخی ،قیس وفریاد سے بڑے عاشق،سعدی اور کالیداس سے بڑے شاعر مراد ہیں۔

اردو میں اسم عام کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

اسم کیفیت، اسم جمع، اسم ظرف، اسم آلہ اس کی چند قسمیں ہیں۔

اسم کیفیت:

وہ اسم ہے جس سے کوئی خاص حالت یا کیفیت معلوم ہوتی ہو۔ جیسے سختی، روشنی، صحت، جلن۔

اسمائے کیفیت دو چیزیں ظاہر کرتے ہیں۔

اول حالت جیسے صحت، نیند، رفتار، سچ، جھوٹ۔

دوم وصفی کیفیت مثلاً درد، خوشی، مطالعہ۔

اسمائے کیفیت کیونکر بنتے ہیں؟

۱۔ بعض فعل سے بنتے ہیں۔ مثلاً چال چلن، گھبراہٹ، لین دین۔

۲۔ بعض صفت سے بنتے ہیں۔ مکاری، خوشی، کھٹائی، دیوانہ پن۔

۳۔ بعض اسم سے بنتے ہیں۔ جیسے دوست سے دوستی، لڑکے سے لڑکپن

۴۔ اکثر عربی، ہندی، فارسی کے الفاظ اسمائے کیفیت کا کام دیتے ہیں۔ جیسے: صحت، حسن، حرکت، بل، کوشش، جوش۔

۵۔ ایک لفظ کی تکرار یا دو لفظوں کے ملنے سے۔ جیسے بک بک، چھان بین، جان پہچان، خوشبور۔

اسم ظرف:

وہ اسم ہے جس میں جگہ یا وقت کے معنی پائے جائیں۔ مثلاً گھر، میدان، جھرنا، چراگاہ۔

بعض علامات ایسی ہیں کہ ان کے لگانے سے اسم ظرف بن جاتا ہے۔ بعض ان میں سے ہندی ہیں اور بعض فارسی۔

ہندی علامات سال (بمعنی جگہ) جیسے گھڑسال (گھوڑوں کے رہنے کی جگہ)۔ ٹکسال (جہاں ٹکے یعنی سکہ بنایا جاتا ہے)۔

شالہ یا سالہ جیسے دھرم سالہ، پاٹ شالہ، گئو سالہ۔ استھان (فارسی ستان) دیواستھان، پرستان، آل۔ یال جیسے: سسرال، ننہیاں، ددھیال

آنہ: سمدھیانہ، سرھانہ۔

کا: جیسے میکا (ماکا)

بعض خاص الفاظ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر اسم ظرف کے معنی دیتے ہیں۔ مثلاً ٹولہ سے قاضی ٹولہ

کھاٹ یا گھٹ: مرگھٹ، پن گھٹ، دھوبی گھاٹ

واڑہ، باڑہ۔ جیسے سید واڑہ، قصائی باڑہ۔

واری۔: پھلواری۔

پارہ۔ جیسے: اوپر پارہ

دوار، دوارہ۔ جیسے ہر دوار، گردوارہ، ٹھاکر دوارہ

گھر۔ جیسے: ڈاک گھر، ریل گھر، ناچ گھر

نگر۔ جیسے سری نگر، احمد نگر۔

پور، پورہ۔ جیسے غازی پور، شولا پور، عثمان پورہ

گڈھ۔ جیسے علی گڈھ، آسمان گڑھ۔

منڈی۔ جیسے: دال منڈی، سبزی منڈی۔

فارسی علامات:

خانہ۔ کتب خانہ۔ ہندی وغیرہ الفاظ کے ساتھ جیسے چنڈو خانہ، چڑیا خانہ، جیل خانہ، ڈاک خانہ

گاہ۔ چراگاہ، شکارگاہ، بارگاہ، درگاہ۔

دان۔ چاءدان، قلم دان، عطر دان، ہندی الفاظ کے ساتھ۔ جیسے پاندان، خاصدان، پیک دان۔

دانی (ہندیوں کا تصرف ہے) سرمہ دانی، تلے دائی۔

زار۔ سبزہ زار، لالہ زار، مرغزار۔

سار۔ کوہسار۔

ستان۔ گلستان، پرستان، کوہستان۔

سرا۔ جیسے: کارواں سرا۔ مہمان سرا۔ کدہ۔ جیسے: آتش کدہ۔

آباد۔ حیدرآباد، اورنگ آباد، اکبرآباد۔

شن۔ گلشن

بعض اوقات فعل سے بھی اسم ظرف بنتا ہے۔ مثلاً بیٹھنا سے بیٹھک، پینا سے پیاؤ۔

کبھی فعل اور اسم کے ملنے سے اسم ظرف بنتا ہے۔ مثلاً بُدرُود، آب چک۔

رمنا اور جھرنا دونوں مصدر ہیں۔ مگر یہ اسم ظرف کے معنوں میں بھی مستعمل ہیں۔ رمنا کے معنی پھرنے کے ہیں۔ ظرفی معنی پھرنے

کی جگہ یعنی چراگاہ کے ہیں۔جھرنا کے معنی پانی رسنے کے ہیں۔ظرفی معنی وہ مقام جہاں سے پانی رستا ہے۔

عربی میں اسم ظرف مفعل اور مفعلہ کے وزن پر آتے ہیں۔ان میں سے اکثر اردو میں بھی رائج ہیں۔مثلاً مکتب، مدرسہ، مقبرہ، مسجد، مجلس، مرقد، مقام، مزار، محشر، مقتل، منبع، مخرج، ماخز وغیرہ۔

اسم آلہ:

وہ اسم جو آلہ یا اوزار کے معنوں میں آئے۔مثلاً چاقو، تلوار، ہتوڑا، درانتی۔

۱۔بعض اسم آلہ فعل سے بنائے گئے ہیں۔

بیلنا سے بیلن، جھولنا سے جھولا۔

دھونکنا سے دھونکنی، جھاڑنا سے جھاڑو۔

چھاننا سے چھلنی، پھانسنا سے پھانسی۔

لٹکنا سے لٹکن، کترنا سے کترنی، پھونکنا سے پھکنی۔

۲۔بعض اسم سے بھی بنتے ہیں۔جیسے:

نہرنا یا نہرنی (بہ معنی ناخن)

ہتوڑا (ہاتھ سے)

دتون (دانت ہے)

۳۔دو اسم مل کر جیسے: دستپنا (دست پناہ) منال (منہ، نال)

۴۔فارسی اسماء کے آگے بعض علامات یا الفاظ بڑھانے سے بنائے گئے ہیں:

ہ کے بڑھانے سے: جیسے دست سے دستہ، چشم سے چشمہ۔

آنہ۔جیسے: انگشت سے انگشتانہ، دست سے دستانہ۔

گیر۔جیسے: کف گیر، گلگیر، آتشگیر۔

کش۔جیسے: بادکش، دودکش۔

تراش۔جیسے: قلم تراش

دان۔جیسے چوہے دان، قلم دان۔

۵۔عربی کے اسمائے آلہ جو اکثر مفعل مفعلہ یا مفعال کے وزن پر ہوتے ہیں۔اردو میں بھی مستعمل ہیں۔مثلاً: مقراض، مشعل، منقار،

مسواک، میزان، مضراب، مسطر، منبر، مصقلہ۔

اسم جمع:

بعض اسم ایسے ہوتے ہیں کہ صورت میں تو واحد معلوم ہوتے ہیں۔لیکن حقیقت میں کئی اسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔جیسے فوج، انجمن، قطار، جھنڈ۔اس قسم کے اسم کو اسم جمع کہتے ہیں۔

.....

مولوی عبدالحق

ضمیر

وہ الفاظ جو بجائے اسم کے استعمال کئے جاتے ہیں، ضمیر کہلاتے ہیں۔ جیسے وہ نہیں آیا۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔ اس میں (وہ) اور (میں) ضمیر ہیں۔ ضمیر سے فائدہ یہ ہے کہ بار بار انھیں اسماء کو جو گزر چکے ہیں دہرانا نہیں پڑتا اور زبان میں الفاظ کے دہرانے سے جو بدنمائی پیدا ہو جاتی ہے، وہ نہیں ہونے پاتی۔

ضمیر کی قسمیں

(۱) شخصی (۲) موصولہ (۳) استفہامیہ (۴) اشارہ (۵) تنکیر

(۱) ضمیر شخصی:

وہ ہے جو اشخاص کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک وہ جو بات کرتا ہے۔ اسے متکلم کہتے ہیں۔

دوسرا وہ جس سے بات کی جاتی ہے۔ اسے مخاطب کہتے ہیں۔

تیسرا وہ جس کی نسبت ذکر کیا جاتا ہے۔ اسے غائب کہتے ہیں۔

ضمائر کی حالتیں وہی ہوتی ہیں جو اسم کی ہیں (سوائے حالت خبری کے) ہر ایک کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

ضمائر متکلم

	واحد	جمع
فاعلی حالت	میں	ہم
مفعولی حالت	مجھے یا مجھ کو	ہمیں یا ہم کو
اضافی حالت	میرا	ہمارا
ظرفی حالت	مجھ میں	ہم میں
طوری حالت	مجھ سے	ہم سے

ضمائرمخاطب:

	واحد	جمع
فاعلی حالت	تو	تم
مفعولی حالت	تجھے یا تجھ کو	تمہیں یا تم کو
اضافی حالت	تیرا	تمہارا
ظرفی حالت	تجھ میں	تم میں
طوری حالت	تجھ سے	ہم سے

ضمائرغائب:

فاعلی حالت	وہ	وہ
مفعولی حالت	اسے یا اس کو	ان کو یا انہیں
اضافی حالت	اسے یا اس کو	ان کا
ظرفی حالت	اس میں	ان میں
طوری حالت	اس سے	ان سے

اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ضمائر غائب میں واحد اور جمع دونوں کے لئے (وہ) آتا ہے اور اس میں اشخاص اور اشیاء کا امتیاز نہیں ہوتا۔ پرانی اردو میں واحد کے لئے (وو) اور جمع کے لئے (وے) استعمال ہوتا تھا۔

(تو) بے تکلفی اور محبت کے لئے آتا ہے۔ جیسے ماں، بچے سے، گرو چیلے سے باتیں کرتا ہے۔ یا مخاطب کی کم حیثیتی کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے آقا نوکر سے باتیں کرتے وقت استعمال کرتا ہے۔

بعض اوقات بہت بے تکلف دوست بھی تو کہہ کر باتیں کرتے ہیں۔

نظم میں اکثر مخاطب کے لئے (تو) لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے لوگوں اور بادشاہوں کو بھی اسی طرح خطاب کیا جاتا ہے۔

بعد شاہاں سلف کے تجھے یوں ہے تفصیل
جیسے قرآن پس توریت وزبور وانجیل (ذوقؔ)
دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ
کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے (میر)

دعا مانگتے وقت خدا سے 'تو' سے خطاب کیا جاتا ہے۔ دوسرے مواقع پر واحد مخاطب کے لئے 'تم' ہی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ سوائے بے تکلفی کے موقع کے، تم بھی اکثر نوکروں اور چھوٹے لوگوں سے خطاب کرتے وقت بولا جاتا ہے۔ ورنہ اکثر اور عموماً واحد مخاطب اور جمع مخاطب دونوں کے لئے (آپ) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آپ، تعظیماً واحد غائب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے اگر چہ لوگ طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے، مگر آپ کو کبھی ملال نہ ہوتا۔ یا جب کوئی شخص کسی کو دوسرے سے ملاتا تو تعظیماً کہتا ہے کہ آپ فلاں شہر کے رئیس ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(ہم) ضمیر متکلم جمع میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بڑے لوگ بجائے واحد متکلم کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہم نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل کیوں نہیں کی گئی، نظم میں یہ تخصیص نہیں۔ واں اکثر واحد متکلم کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تیری عادت ہی سہی
ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ　　ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

کبھی متکلم عمومیت کے خیال سے (ہم) استعمال کرتے ہیں۔ جیسے یہ چند روزہ صحبت غنیمت ہے ورنہ پھر ہم کہاں تم کہاں۔
ہماری قسمت ہی بری ہے جو کام کیا بگڑ گیا۔ وہ بڑے ضدی ہیں کسی کی کیوں ماننے لگے۔ آخر ہمیں کو دینا پڑے گا۔

بعض اوقات اس کا استعمال مبہم ہو جاتا ہے اور صحیح طور سے نہیں معلوم ہوتا ہے متکلم کے ساتھ کون شریک ہے۔ مثلاً کوئی کہئے ''میرا ساتھ کون دے گا۔'' اس کے جواب میں دوسرا شخص کہے۔ ''ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے''۔ اگر یہ کہنے والا واحد ہے، مگر دوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے۔

بعض اوقات اس کے ساتھ دوسرے الفاظ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے: ہم رعایائے سرکار، ہم شرکائے مجلس۔

کبھی کبھی محض انکسار کی غرض سے جب کہ اپنی شخصیت کا اظہار سننے والوں کے سامنے مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ گویا متکلم اپنی رائے یا فعل کو دوسروں کی آڑ میں چھپا لیتا ہے۔ جیسے ہماری رائے میں تعلیم کی اصلاح میں نہایت سرگرمی سے کوشش کرنی چاہئے۔

اس کا استعمال زیادہ تر اخباروں کے اڈیٹر کرتے ہیں جو گویا اہل ملک کے نائب ہیں۔

بعض اوقات یار اور یاروں کا لفظ واحد متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: یار تو گوشۂ تنہائی میں رہتے ہیں، کہیں آئیں نہ جائیں۔ یاروں

سے بچ کر کہاں جائے گا۔ یاروں کا لفظ واحد متکلم اور جمع متکلم دونوں کے لئے آتا ہے۔ مگر عموماً بے تکلفی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعمال کسی قدر عامیانہ سمجھا جاتا ہے۔

کیا مدنظر تم کو ہے یاروں سے تو کہئے　　گر منھ سے کہتے اشاروں سے تو کہئے (ذوقؔ)

جب کسی جملے میں کوئی اسم یا ضمیر فاعلی حالت میں ہو اور وہی مفعول بھی واقع ہو تو بجائے ضمیر مفعولی کے آپ کو ''اپنے تئیں'' یا ''اپنے آپ'' کو استعمال کرتے ہیں جیسے احمد آپ کو دور کھینچتا ہے یا اپنے تئیں بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ یا اپنے کو فاضل خیال کرتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی اسم یا ضمیر کسی فقرے میں فاعل ہے اور اس کی اضافی حالت لانی منظور ہو تو بجائے اصل ضمیر اضافی کے اپنا، اپنی یا اپنے حسب موقع استعمال ہوں گے۔ جیسے: امجد اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔ تم اپنا کام کرو، مجھے اپنے کام سے فرصت نہیں۔ وہ خود تو چلے گئے مگر اپنا کام مجھ پر چھوڑ گئے۔ یہ اسی حالت میں جب کہ فاعل ایک ہو۔ اگر فاعل الگ الگ ہیں تو (اپنے) کی ضمیر نہیں آئے گی بلکہ جس ضمیر کا موقع ہوگا اس کی اضافی حالت لکھی جائے گی۔ جیسے: وہ تو چلے گئے مگر ان کا کام مجھ پر آ پڑا۔ یہاں چلے گئے کا فاعل ''وہ'' ہے۔ اور آ پڑا کا فاعل 'ان کا کام ہے۔' جیسے تم چلے گئے مگر تمہارا کام انہوں نے مجھے سونپ دیا کا فاعل انہوں نے۔

اپنا اور اپنی مضاف کے لحاظ سے حسب ترتیب واحد مذکر، واحد و جمع مؤنث اور جمع مذکر کے لئے آتے ہیں۔ اگر حروف ربط میں کوئی مضاف کے بعد آجاتا ہے۔ تو (اپنا) بدل کر (اپنے) ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے کام سے غافل ہے۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں۔

دراصل ایسے فقروں میں اصل ضمیریں اپنا، اپنی سے بدل گئی ہیں۔ مثلاً: مجھے اپنے کاموں سے فرصت۔ اصل میں تھا، مجھے میرے کاموں سے فرصت نہیں۔

آپ اور اپنا دوسرے ضمائر کے ساتھ تاکید کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً: حالت فاعلی، میں آپ آ گیا تھا۔ وہ آپ آئے تھے، تم آپ گئے تھے، حالت اضافی میں جیسے میرا اپنا کام تھا۔ یہ ان کا اپنا باغ ہے۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے　　اور کے لین دین سے کیا کام (غالبؔ)

فارسی کا لفظ خود بھی (جس کے معنی آپ یا اپنے کے ہیں) انھیں معنوں میں آتا ہے۔

جیسے: انھوں نے خود فرمایا۔ خود بعض حالتوں میں زیادہ فصیح ہے اور خصوصاً حالت مفعولی میں۔ جیسے: میں نے خود اسے دیا۔ یہاں خود کے استعمال سے ابہام پایا جاتا ہے کے خود کا تعلق (میں) سے ہے یا (اسے) سے۔ لہٰذا اس کے رفع کے لئے ایسے موقعوں پر استعمال کی یہ صورت ہونی چاہئے کہ جس لفظ سے اس کا تعلق ہو اس کے اول استعمال کیا جائے مثلاً اگر یہاں خود کا تعلق (میں) سے ظاہر کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے۔ ''خود میں نے اسے دیا'' مگر حالت اضافی میں خود کا کہنا فصیح نہیں ہے۔ ایسے موقعے پر (اپنا) زیادہ فصیح رہے گا۔ مثلاً: ''خود کا خود کرنا چاہئے۔'' کی بجائے ''اپنا کام آپ کرنا چاہئے''، زیادہ فصیح ہوگا۔

۲۔ضمیر موصولہ:

وہ ہے جو کسی اسم کے بجائے آتی ہے۔مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جملہ ہوتا ہے جس میں اس کے اسم کا بیان ہوتا ہے، جیسے وہ کتاب جو کل چوری گئی تھی، مل گئی۔آپ کے دوست جو چیچک رو ہیں مجھے ملے تھے۔ پہلے جملے میں 'جو' کتاب کے لئے اور دوسرے میں 'جو' دوست کے لئے۔اور ساتھ کے جملوں میں دونوں اسموں کا بیان ہے۔

ضمیر موصولہ صرف (جو) ہے، جس کی مختلف حالتیں یہ ہیں۔

	واحد	جمع
	جو، (حرف نے کے ساتھ)	جو، (حرف نے کے ساتھ)
فاعلی حالت	جس نے	جنہوں نے
مفعولی حالت	جس کو یا جسے	جن کو یا جنہیں
	(مذکر) جس کا	جن کا
اضافی حالت	(مونث) جس کی	جن کی
ظرفی حالت	جس میں	جن میں
طوری حالت	جس سے	جن سے

جن کو، جنہیں، جنہوں نے، جن کا، اگر چہ جمع ہیں مگر تعظیماً واحد کے لئے بھی آتے ہیں جس اسم کے لئے یہ ضمیر آتی ہے، اسے مرجع کہتے ہیں۔

ضمیر موصولہ ہمیشہ ایک جملے کے ساتھ آتی ہے اور دوسرا جملہ اس کے جواب میں ہوتا ہے۔مثلاً: وہ کتاب جو کل خریدی تھی جاتی رہی۔اس میں دو جملے ہیں۔ایک 'جو کل خریدی تھی' دوسرا وہ کتاب جاتی رہی'۔اس میں 'جو' ضمیر موصولہ ہے۔

(جو) حالت فاعلی میں واحد اور جمع دونوں میں یکساں استعمال ہوتا ہے مگر جب فاعل کے ساتھ 'نے' ہو تو واحد میں (جو) بھیس بدل کر (جس) اور جمع میں (جنہوں) ہو جاتا ہے۔مثلاً جس نے ایسا کیا برا کیا۔وہ لوگ جنہوں نے قصور کیا تھا معاف کر دیئے گئے۔

کبھی (جو) کے جواب میں فقرۂ ثانی میں (سو) آتا ہے۔جیسے جو ہو سو ہو۔جو چڑھے گا سو گرے گا۔

(جَون) بھی ہندی ضمیر موصولہ ہے مگر اردو میں (سا) کے ساتھ آتا ہے۔جیسے ان میں سے جَون سا چاہو لے لو۔جمع میں (جون سے) اور واحد و جمع مؤنث میں (جون سی) استعمال ہوتا ہے۔

کبھی (کہ) بطور ضمیر موصولہ کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے۔

میں کہ آشوب جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت　　امن کو سمجھا غنیمت دل غم دیدہ بہت (آزاد)

جو، جس اور جن بہ تکرار بھی آتے ہیں اور واحد یا جمع کی حالت میں ان کا اطلاق فرداً فرداً ہوتا ہے۔ مثلاً: جو جو پسند ہو لے لو۔ جن جن کے پاس گیا انہوں نے یہی جواب دیا۔

ضمائر استفہامیہ:

جو سوال پوچھنے کے لئے آتی ہیں دو ہیں۔ کون اور کیا (کون) جاندار کے لئے آتا ہے۔ (کیا) بے جان کے لئے۔

جیسے: کون کہتا ہے، کیا چاہئے۔

(کون) کی مختلف حالتیں یہ ہیں:

	واحد	جمع
فاعلی حالت	کون اور (نے کے ساتھ)	کون (نے کے ساتھ)
	کس نے	کنھوں نے
مفعولی حالت	کیسے یا کسی کو، کس سے،	کن کو یا کنھیں، کن سے
اضافی حالت	کس کا	کن کا
ظرفی حالت	کس میں	کن میں
طوری حالت	کس سے	کن سے

جیسے: کون کہتا ہے، کس نے کہا، کس کے پاس ہے، کس کو دیا؟ کن، اب صورت فاعلی میں کبھی ضمیر کے بجائے نہیں آتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے: کن لوگوں نے کہا؟

کس کس، کن کن اور کیا کیا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے: کس کس کو روؤں، کن کن سے کہوں، کیا کیا کروں۔

کون کون بھی بولتے ہیں جیسے وہاں کون کون تھے؟ ان فقروں میں فعل کئی اشخاص یا اشیاء پر فرداً فرداً واقع ہوتا ہے اور جمع کا ہونا بتاتا ہے۔

کون سا (کون سی، کون سے) بھی بجائے ضمیر مستعمل ہے۔ کون اور 'کون سا' میں فرق اتنا ہے کہ (کون سے) میں ذرا خصوصیت پائی جاتی ہے اور یہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کہ کئی چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب مقصود ہو۔ مثلاً: ان میں سے کون سی چاہئے؟ یہاں

(کون) نہیں کہیں گے (سا) کے ساتھ (کون) اشخاص اور اشیاء دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ضمائر اشارہ:

جو بطور اشارہ کے استعمال ہوتی ہیں ''وہ'' بعید کے لئے۔ ''یہ'' قریب کے لئے۔ ضمائر اشارہ اور ضمائر غائب شخصی ایک ہی ہیں۔ لیکن جب بطور اشارہ استعمال ہوتی ہیں تو انھیں ضمائر اشارہ کہتے ہیں۔ جیسے: وہ لوگ یا یہ۔ حروف ربط کے آنے سے وہ اُس سے اور یہ اس سے بدل جاتا ہے۔ اور جمع میں اُن اور ان ہو جاتا ہے۔

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز　　اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اس میں

ضمائر تنکیر:

وہ ہیں جو غیر معین اشخاص یا اشیاء کے لئے آئیں۔

ضمائر تنکیر دو ہیں، ''کوئی'' اور ''کچھ''

(کوئی) اشخاص کے لئے اور (کچھ) اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ہے؟ کوئی نہیں بولتا۔ کچھ ہے یا نہیں؟ کچھ نہ کہو۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

حروف ربط کے آنے سے 'کوئی' کی صورت 'کسی' ہو جاتی ہے۔ جیسے: کسی کے پاس نہیں۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

جب یہ ضمائر تکرار کے ساتھ کوئی کوئی اور کچھ کچھ استعمال ہوتے ہیں تو اس میں خاص زور پایا جاتا ہے۔ مگر معنی قلت کے آتے ہیں۔ جیسے: اب بھی کوئی کوئی نظر پڑ جاتا ہے۔

اگر چہ نایاب ہے مگر کسی کسی کے پاس اب بھی مل جاتی ہے۔ ابھی کچھ کچھ درد باقی ہے۔ نفی کے ساتھ بھی بہ تکرار آتا ہے۔ جیسے: ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا۔ کوئی نہ کوئی مل ہی رہے گا۔

عربی کے الفاظ 'بعض' اور 'بعضے' بھی ضمیر تنکیر کا کام دیتے ہیں۔ بعض کا یہ خیال ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں۔ ''بعض'' تکرار کے ساتھ بھی آتا ہے۔ جیسے بعض بعض ایسے بھی ہیں۔ اسی طرح 'فلاں'، 'گل' اور 'چند' بھی بطور ضمیر تنکیر کے استعمال ہوتے ہیں۔

ضمائر تنکیری دوسرے ضمائر کے ساتھ مل کر مرکب بھی آتی ہیں جیسے جو کوئی، جو کچھ، جس کسی، ہر کوئی۔ جیسے: جس کسی کو کہتا ہوں وہ الٹا مجھی کو قائل کرتا ہے۔ جو کچھ کہو بجا ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

پروفیسر محمد مجیب

کھیتی (ڈراما)

اشخاص

عبدالغفور

مولوی عبدالرحمان

کرم علی- مال دار تاجر

دلدار حسین- رئیس، زمیندار، میونسپلٹی بدار میونسپلٹی کا ممبر جو شہر کے با اثر آدمیوں میں سے ہے۔

حشمت اللہ۔ میونسپلٹی کا ایک ملازم- خوش حال آدمی۔

حسام الدین- تعلیم یافتہ، خاصا خوش حال زمیندار، شہر کے قریب ایک قصبے میں رہتا ہے۔

عبدالقیوم

محمد حسین طالب علم

عبداللطیف

مولا بخش- لُہار

اللہ دین۔ مولا بخش کا بھتیجا۔

ایک مستری، دو مزدور خادم، مجمع کے لوگ، غریب اور مَیلے کپڑوں میں راہ رو وغیرہ۔

پہلا ایکیٹ

پہلا سین

حسام الدین کے مکان کے سامنے پھلواری۔ دائیں بائیں پھول دار درختوں کی قطاریں۔ پیچھے مکان کے سامنے کا حصہ، بیچ میں ایک میز ہے، جس کے ایک طرف حسام الدین اور دوسری طرف حشمت اللہ بیٹھا ہے، میز پر چائے لگی ہے اور حشمت اللہ کے ہاتھ میں پیالی ہے۔

حسام الدین: کہئے چائے بہت بدمزہ تو نہیں ہے؟ میں تو آپ جانتے ہیں کبھی پیتا ویتا نہیں۔ آپ کے آنے کی خبر سنی تو جلدی سے منگوا بھیجی، معلوم نہیں، نوکر کون سی پتی لایا اور کیسے بنائی۔ سچ پوچھئے تو مجھے چائے کے معاملے میں ذرا بھی تمیز نہیں۔

حشمت اللہ: (مسکرا کر) خیر آپ نے چائے چھوڑ دی یہ اچھا کیا۔ اس کم بخت سے تو صرف معدہ ہی خراب ہوتا ہے۔ مگر میں آپ کے اس بن باس کا قائل نہیں۔

حسام الدین: جناب بن باس بہت بڑا لفظ ہے۔ مجھ جیسوں کی نسبت اسے استعمال کر کے آپ اس کی خواہ مخواہ ذلت کرتے ہیں۔ میں نہایت لالچی دنیادار آدمی ہوں پیسے پیسے پر جھگڑا کرتا ہوں، پیسے پیسے کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہوں۔ کہاں میں اور کہاں بن باس!

حشمت اللہ: پیسا تو پھر بھی بہت ہوا۔ روپے کی قدر کرنے والے تو کوڑیوں کے پیچھے بھی جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔ میرا مطلب مگر کچھ اور ہی تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کا ہم لوگوں سے، مہذب، تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت سے، شہری زندگی کی دل چسپیوں سے الگ ہونا بُرا ہے۔ آپ کفایت شعار ہمیشہ سے تھے۔ یہ تو مجھے بھی خوب معلوم ہے، لیکن بے لطفی سے زندگی بسر کرنا کیسی کفایت شعاری ہے، شہر میں خرچ زیادہ ہوتا ہے یہ میں نے مانا، مگر آپ تو خدا کے فضل سے خوش حال ہیں۔ آپ کو کاہے کی فکر ہے، سلیقے سے خرچ کیجیے، چین سے رہیے۔ جایداد کے انتظام کے لیے کوئی آدمی رکھ لیجیے۔ کچھ ایسا دشوار کام تو ہے نہیں، اور نہ اس میں آپ کی سی قابلیت کے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسام الدین: جی میں اپنی قابلیت اور استعداد کو خوب جانتا ہوں۔ ورنہ یہاں کی تنہائی کیوں گوارا کرتا، مگر میرا رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ عقل مند ہو کر شہر میں رہنے سے بے وقوف ہو کر گاؤں میں رہنا بہتر ہے۔ یہاں صحبت نہیں، دل چسپیاں نہیں، مگر بھوک خوب لگتی ہے، نیند بھی خوب مزے کی آتی ہے اور مجھ جیسوں کو اس سے زیادہ اور چاہیے کیا؟

حشمت اللہ: نہیں بھائی ہم پر تو اس زبردستی کے انکسار کا اثر ہوتا نہیں اور نہ ہم آپ کا اس طرح گاؤں میں بیٹھ کر عمر ضائع کرنا گوارا کر سکتے ہیں۔ قوم کو آپ جیسے تعلیم یافتہ اور روشن خیال جوانوں کی بہت سخت ضرورت ہے، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں اس صورت میں یہاں

پڑے رہنا اپنے فرض سے منہ چھپانا ہے۔ جب ناخدا ہی منہ چھپا کہ بیٹھ رہے تو قوم کا بیڑا کیا خاک پار پہنچے گا۔

حسام الدین: اجی کیسا بیڑا اور کہاں کے فرائض؟ دو برس تک شہر کی خاک چھانتا رہا، کسی نے پوچھا تک نہیں۔ اب ذرا دل کو سمجھا بجھا کہ یہاں رہنے پر راضی کیا ہے تو آپ پہنچے فرض اور ناخدائی کا قصہ سنانے۔ میں تو اب یہاں سے کھسکتا نہیں۔

حشمت اللہ: خیر، آپ کھسکنا نہ چاہیں تو کوئی آپ کو کھسکا بھی نہیں سکتا، مگر آپ کی شکایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ عبدالغفور صاحب ہمارے معزز قومی رہنما تو آپ کے عزیز ہوتے ہیں اور جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں، انہیں آپ کی سرپرستی کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا بلکہ وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ اگر آج کل جیسے مشکل زمانے میں آپ ان کی مدد کو پہنچیں۔ دلدار حسین، ہمارے شہر کے روح رواں، بھی ہمیشہ سے آپ کو مانتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمان صاحب جب دیکھئے اسی کا دُکھڑا روتے ہیں کہ میرا حسام الدین جب سے گانّو میں بیٹھ رہا تب سے محفلیں سونی پڑ گئی ہیں۔ گفتگو بے مزہ ہوگئی ہے۔ آخر یہ سب لوگ آپ کے بزرگ ہی تو ہیں۔ اُن کا دل نہ دُکھایئے۔

حسام الدین: جناب میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ دو برس شہر کی خاک چھان چکا ہوں۔ آپ شاید میرا مطلب نہیں سمجھے، یہی رہنما اور سرپرست اور قدردان تھے جن کی بدولت میری عمر ضائع ہوئی۔ دودھ کا جلا ہوں۔ اب تو چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیوں گا۔

حشمت اللہ: ارے بھائی کم زوریاں ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ ان کو معاف کر دینا چاہیے اگر ہر شخص تمھاری طرح گھر بیٹھا کرے تو دنیا کا کام کیسے چلے۔ چھوٹی چھوٹی..... باتیں ہیں، انھیں اتنی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ بس اب غصہ تھوک دو۔ چلو لطف رہے گا۔.....(ذرا سوچ کر) اور مانا کہ آپ کا غصہ بے جا نہیں۔ پھر بھی یہاں بیٹھے بیٹھے کڑھنے سے آخر کیا فائدہ۔ اپنی ہی عمر بے لطفی سے گزرے گی، یہاں کوئی ایسا بھی تو نہیں کہ جی گھبرائے تو دو چار باتیں کر لو .... نہ تھیٹر ہے، نہ سینما، عورتوں کی شکلیں جو یہاں نظر آتی ہیں وہ بھی ماشاءاللہ .... کپڑے ایسے کہ جدھر جائیں اُدھر بدبو پھیلا دیں۔ بھولے سے اُن کی طرف دیکھ لو تو ہفتے بھر آنکھیں دُکھتی رہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بھلے آدمی کے رہنے کی جگہ ہے۔

حسام الدین: (جس نے تقریر غور سے نہیں سنی ہے اکتائے ہوئے لہجے سے) جی ہاں، میں یہاں آیا تھا تو نفاست اور تہذیب کو خیر باد کہہ کر اور اب اُن کو دُور ہی سے سلام ہے۔

حشمت اللہ: مگر آخر کیوں؟

حسام الدین: (بے زار ہو کر) جناب سنئے۔ جو شخص ہفتے بھر کام کرنے کے بعد ایک دن گپ بازی کرے اسے تو اس میں لطف آ سکتا ہے اور ایسی تفریح کا اس کو ایک طرح سے حق بھی ہے، لیکن ہفتے میں ساتوں دن فضول بکواس کرنا وقت خراب کرنا ہی نہیں بلکہ شہدا پن ہے۔ میں خود اس کا تجربہ کر چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب تک کوئی کام کرنے کو نہ ہو، آدمی کو آپ ہی آپ یہ روگ لگ جاتا ہے۔ رہا کام، سو نوکری میں کرنا نہیں چاہتا۔ تجارت کا مجھے ڈھنگ نہیں آتا، کسی فن کو میں جانتا نہیں کہ اسی میں اپنی جان کھپا دوں۔ قوم کی خدمت

کرنے کی میں دوسال فکر میں رہا۔لیکن کوئی خدا کا بندہ ایسا بھی تو نہ ملا جو مجھے بتا سکے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیوں اور کیسے۔خدمت، خدمت سب چلاّتے ہیں،مگر سوا اس کے کہ وہ چلاّتے ہیں، میں نے انھیں اور کوئی خدمت کرتے دیکھا نہیں۔ممکن ہے قوم لوگوں کے اسی طرح چلاّنے سے جاگ اُٹھے۔لیکن یہ جگانے کا نہایت ایک بے تکا طریقہ ہے اور ہماری قوم بڑی ہی نکمی ہے۔اگر اٹھتے ہی وہ اپنے جگانے والوں کو تھپڑ نہ لگائے۔میں نہ قوم کو اس طرح جگانا چاہتا ہوں نہ بعد کو تھپڑ کھانا۔قوم سوتی ہے تو اسے اس کی نیند مبارک ہو۔میں اس میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا اور جگے تو اُسے نئی زندگی مبارک ہو، میرے لیے یہ ذرا سی کھیتی اور چھوٹا سا اسکول کافی ہے۔مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ اتنا حوصلہ کہ ساری قوم کو جگانے یا ٹھیک رستے پر چلانے کا ذمہ اپنے سر لوں۔

حشمت اللہ: واہ، واہ، واہ آپ بھی بڑی جلدی بگڑ جاتے ہیں۔میں نے تو بس دوستانہ طریقے پر مشورہ دیا تھا کہ شہر میں چل کر رہیے۔میں آپ کو خفا تھوڑی ہی کرنا چاہتا ہوں۔یوں تو آپ کا جہاں جی چاہے رہیے۔میرا تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔میں نے تو ایسے ہی بات کہنے کے لیے.....

حسام الدین: (کچھ دیر سوچ کر، اور ٹھنڈی سانس بھر کر) جی ہاں وہ بزرگ جن کے نام آپ نے مجھ پر رعب جمانے کو سنائے تھے آخر میں سب کے سب یہی کہہ کر پہلو بچا لیتے ہیں۔آپ کے عبدالغفور صاحب نے قوم کی خدمت کے سلسلے میں بزازوں کے مقابلے میں بڑی دھوم دھام سے ایک کپڑے کی دکان کھلوائی تھی۔کسی تاجر نے حماقت سے اپنا روپیا لگا دیا۔بچارے کا کپڑا سارا مفت منگوا منگوا کر پہن ڈالا اور جب اس نے ضرورت کے وقت تھوڑا سا روپیا قرض مانگا تو اس سے خفا ہو گئے۔سارے شہر میں منادی کرادی کہ اس کے یہاں کوئی بھولے سے بھی بالشت بھر کپڑا نہ لے اور غریب کو بالکل تباہ کر دیا۔پھر یہ دکھانے کو کہ ایک نالائق سوداگر کے دیوالیے ہو جانے سے قوم مایوس نہیں ہو سکتی، انھوں نے ایک اور شخص کو آٹے کی دکان کھولنے پر طرح طرح کے وعدے کر کے آمادہ کر لیا۔اس کی بھی وہ حالت ہے کہ خدا رحم کرے.....

حشمت اللہ: (ہنس کر) ہاں، وہ بھی بہت جلد ختم ہو جائے گی، کچھ حالات ایسے ہی ہیں .....لیکن عبدالغفور صاحب میں یہ کم زوری ہے کہ وہ ہر کام سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں اور استقلال سے اس میں جٹے نہیں رہتے۔تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ ہوں یا کوئی اور سب ایسا ہی کریں گے۔آپ کی طبیعت میں تو ماشاءاللہ استقلال کی کمی نہیں.....

حسام الدین: عبدالغفور صاحب ہوں یا میں یا کوئی اور، سبھی ایک سے ہیں۔وہی ایک موٹی سی بات ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی .....خیر .... اگر آپ چائے پی چکے ہوں اور سیر کرنا چاہیں تو چلیے آپ کو اپنا نیا آموں کا باغ دکھلاؤں، نہیں تو پھر بہت دیر ہو جائے گی۔

حشمت اللہ: (جلدی سے چائے کی پیالی ختم کر کے) ضرور چلیے۔

(دونوں اُٹھ کر چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا سین

عبدالغفور کے مکان کا ایک کمرہ۔ اس میں ایک دری بچھی ہے، پیچھے کی دیوار سے لگا ہوا ایک قالین ہے، جس پر گاؤتکیہ رکھا ہے..... دالدار حسین: قالین کے ایک طرف۔ مولوی عبدالرحمان اور کرم علی دوسری طرف بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد عبدالغفور داخل ہوتا ہے۔ سب اس کے آتے ہی السلام علیکم کہہ کر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔

عبدالغفور: وعلیکم السلام .....(تینوں کو کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) ارے ہائیں ہائیں ہائیں، آپ لوگ مجھے اس تکلف سے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ بھلا میں اس لائق ہوں کہ آپ حضرات میرے داخل ہونے پر کھڑے ہوں، بلکہ آپ لوگوں کو تو مجھے دیکھتے ہی ڈانٹنا چاہیے تھا کہ اتنی دیر ہم کو بٹھائے کیوں رکھا، آپ الٹی تنظیم کرتے ہیں..... دلدار حسین صاحب آپ مسند پر تشریف رکھئے۔ مجھ سے یہ گستاخی نہ ہو سکے گی کہ آپ کی موجودگی میں مسند پر بیٹھوں (دلدار حسین جھک کر سلام کرتا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے انکار کر دیتا ہے) تو پھر مولوی صاحب آپ ہی تکلیف فرمائیے (مولوی صاحب کی بانہہ پکڑ کر) بس آیئے، آیئے تکلف نہ کیجیے۔

مولوی عبدالرحمان: نہیں صاحب، میں کیسے مسند پر بیٹھ جاؤں۔ آپ میزبان ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے جلسے کے صدر ہیں۔ مسند پر آپ کے سوا کسے بیٹھنے کا حق ہوسکتا ہے؟ بس اب تکلف نہ کیجیے۔ بسم اللہ تشریف رکھیے۔

عبدالغفور: تو پھر مجبوری ہے۔ (تینوں کو سلام کر کے مسند پر بیٹھ جاتا ہے).....معاف کیجیے گا، آپ حضرات کو اتنی دیر منتظر رکھا۔ کیا کروں آج کل تو ایسی مصیبت میں پھنسا ہوں۔ بیوی بیمار، لڑکیاں بیمار، بچہ بیمار، ڈاکٹر حکیم جتنے ہیں وہ سب اپنی اپنی تشخیص کرتے ہیں، اپنی اپنی دوائیں لکھ جاتے ہیں۔ اتنا مجھ پر احسان کرتے ہیں کہ فیس نہیں لیتے، اور لیتے بھی تو غریب اور دیوانہ دیتا کہاں سے، مگر ان کی دوائیں خریدتے خریدتے دیوالہ نکلا جاتا ہے۔ ذرا مہلت ملے تو کچھ کماؤں، خاندان کی کچھ خبر لوں۔ مگر میرا دل کب مانتا ہے کہ اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے ملت اور قوم کی ضرورتوں کو نظر انداز کروں، مولوی صاحب میری ساری زندگی آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ایک دن آرام سے نہیں گزرا، ایک رات چین سے نہیں سویا ہوں۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں میری غفلت سے ملت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور قیامت کے روز کوئی مسلمان بھائی کھڑا ہو کر خدا سے میری شکایت کرے کہ اس شخص نے جس کو تو نے ہمارا پاسبان بنایا تھا اپنا فرض ادا نہیں کیا اور اپنی فکروں میں ایسا ڈوب گیا کہ ملت کی آبرو تک کی خبر نہ رہی۔ دلدار حسین صاحب میرے بزرگ ہیں انھیں بہت کچھ میری نسبت معلوم ہے۔ میری غریبی پر ان کو ترس آتا ہے۔ برسوں سے سمجھا رہے ہیں کہ سب کی فکر کرتا ہے۔ اپنی اور اپنے گھر کی بھی تجھے کوئی خبر ہے؟ اب بچارے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے ہیں۔ گھر والوں کی شکایتیں سنتے سنتے میں بے حیا ہو گیا ہوں، مگر کیا کروں سب

کچھ برداشت کرتا ہوں، اس لیے کہ وہ درد جو قوم کی حالت دیکھ کر دل میں اُٹھتا ہے اور ساری تکلیفوں سے کہیں زیادہ شدید ہوتا ہے۔ میرا پہلے ارادہ تھا کہ عمر کے صرف چند سال ہی قوم کی نذر کروں گا مگر وہ مدت کبھی پوری نہ ہوئی ... (منہ پر ہاتھ پھیر کر) خیر یہ داستان تو بہت لمبی ہے۔ اسے سنا کر میں آپ حضرات کا وقت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے سامنے وہ معاملہ پیش کروں جس کی وجہ سے آپ حضرات کو تکلیف دی ہے۔

دلدار حسین: جی فرمایئے!

عبدالغفور: یہ تو آپ حضرات سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس مسئلے کا آپ سے ذکر کرنے والا ہوں اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں۔ میرے چاہے کوئی دس جوتے مارے، مجھے کوئی پروانہ ہوگی۔ دعا دے کر بیٹھا رہوں گا۔ اگر اس کا ثبوت درکار ہو تو کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے مجھ پر روزانہ ایسے وار ہوتے ہیں جو جوتوں کی مار سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں، کیونکہ ان سے دل پر چوٹ لگتی اور آبرو پر حرف آتا ہے۔ میں بیچارا غریب، جواب دوں بھی تو کس کس کا، صبر کر کے بیٹھ رہتا ہوں اور خدا سے دعا مانگ لیتا ہوں کہ دل کو درد سے محفوظ رکھنا منظور نہیں تو کم سے کم آبرو میں بٹّا نہ لگنے دے۔ اور میرا یہ رویّہ کچھ آج یا کل کا شروع کیا ہوا نہیں۔ میری بچپن سے یہ عادت رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ بھائی جان مرحوم نے امّاں جان سے میری جھوٹی شکایت کر دی۔ انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا، ایک وقت کا کھانا نہیں دیا اور کئی روز تک ناراض رہیں، مگر بھائی جان مرحوم کے خلاف میری زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ اس کا بھائی جان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس دن سے پھر کبھی مجھ پر خفا تک نہ ہوئے۔ اور اماں اگر کبھی سزا دینا چاہتیں تو ہمیشہ رو دھو کر مجھے بچا لیتے۔ مرتے دم تک مرحوم کا یہی سلوک رہا۔ لوگوں نے میرے خلاف انھیں بہت بھڑکایا، لیکن انھوں نے کبھی کسی کی بات نہ سنی اور بہتوں کو یہ واقعہ سنا کر ایسا قائل کر دیا کہ وہ بھی مجھے ماننے لگے۔ خیر یہ داستان بہت لمبی ہے اسے سنا کر میں آپ حضرات کا وقت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اب اصل واقعہ سینے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بھگوان ملز کے احاطے کے سامنے ایک کشادہ میدان ہے جس میں مل کے مسلمان ملازم اکثر مغرب کی نماز پڑھا کرتے ہیں۔ میدان میں شام کے وقت پان، تمباکو، پوری، کچالو وغیرہ کی دکانیں لگ جاتی ہیں اور آپ تو خوب جانتے ہیں کہ مسلمان کی جیب میں پیسا پہنچ جائے تو اسے پھینکنے کی فکر میں کیسا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ غرض کہ میدان میں جو دکانیں لگتی ہیں یا یوں کہیے لگتی تھیں۔ ان کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور ہمارے مسلمان بھائی جو دن بھر محنت کر کے نکلتے تھے، ان کی اچھی خاصی تفریح۔ مگر شام کو نماز ضرور رہوتی تھی۔ آپ لوگوں کا ..... ادھر کیوں کبھی گزر ہوتا ہوگا، لیکن میں اکثر وہاں نماز پڑھ چکا ہوں۔ ایک دو بار جب امام صاحب بچارے نہیں آسکے تو پڑھا بھی چکا ہوں۔ اب آپ بتایئے کہ اس سے کس کا نقصان ہوتا تھا، جو لوگ وہاں دکانیں لگاتے تھے، ان کا یا جس شخص کی زمین پر دکانیں لگتی تھیں اور جو دکان داروں سے کرایہ وصول کرتا تھا۔ اس کا، یا مِل والے کا، جس کے ملازموں کو مفت میں تفریح کا موقع مل جاتا تھا؟ مگر نہیں صرف اس وجہ سے کہ سیر کے لیے زیادہ تر مسلمان آتے تھے اور دکان دار بھی زیادہ تر مسلمان ہی ہوتے تھے جناب پروپرائٹر صاحب بھگوان

ملز نے زمین کے مالک سے، جو ظاہر ہے کہ ہندو ہیں، اس لیے کہ غریب مسلمان کو بھلا کب کوئی ایک گز بھر زمین خریدنے دے گا۔ جناب ان دونوں نے کہہ سن کر میونسپلٹی سے ایک نوٹس لگوا دیا کہ اس زمین پر دکانیں لگانا اور جماعت سے نماز پڑھنا اور غالباً گھومنا پھرنا بھی منع ہے اور میونسپلٹی والوں نے اس خیال سے کہ ان کے نوٹس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جائے گی۔ پولیس کو ہدایت کی کہ وہاں باقاعدہ پہرہ رکھا جائے۔ اب کسی کی مجال نہیں کہ وہاں جا کر ٹہلے یا دکان لگائے یا نماز پڑھے۔ آپ خود غور کیجیے کہ یہ کیسا کھلا جبر اور تشدد ہے اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، جناب فوراً دعوا دائر ہو جائے۔ فوجداری کا مقدمہ چل جائے۔ اخباروں میں فساد پھیلانے کا الزام علانیہ لگایا جائے اور یہ اندیشے ظاہر ہونے لگیں کہ یہ مسلمان غدار ضرور شاہ افغانستان کو ہندستان فتح کرنے کی دعوت دے کر رہیں گے۔ بنیے کی بزدلی کا ٹھکانا، اپنی جان اور مال کے لیے وہ جتنا ڈرائے، دھمکائے اور جھوٹ الزام لگائے وہ کم، مگر لطف تو یہ ہے کہ سچ بولے یا جھوٹ، زبان اسی کی ہے۔ اخبار اسی کے، نیوز ایجنسی اسی کی۔ ہم بچارے کچھ کرنا چاہیں تو کیا کریں اور کہیں بھی تو کس سے، ہمارے اپنے آدمی اسی کی بات سنتے ہیں اور مجبوراً اسی کو مانتے ہیں۔ میں تو برسوں سے اس شہر کے تمام مال دار مسلمان بھائیوں کو سمجھا رہا ہوں کہ کسی طرح سے تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا کر کے اپنی نیوز ایجنسی قائم کیجیے۔ اس کی کامیابی کا میں ذمہ داری، اس میں خرچ برائے نام ہے اور نفع بے انتہا۔ مجھے تو ایک مسلمان نیوز ایجنسی کی کامیابی کا اتنا یقین ہے کہ اکثر حضرات سے میں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر سالانہ کا پچاس فی صدی سے کم فائدہ ہو تو بقیہ رقم وہ مجھ سے لے سکتے ہیں (مسکرا کر) اس لیے کہ جہاں انھیں معلوم ہے کہ میں مفلس ہوں وہاں مجھے بھی معلوم ہے کہ مطالبہ کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ مگر مجھ غریب کی بات کون سنتا ہے، کون مانتا ہے۔ اخبار پر خرچ کرنے کو اکثر راضی ہو جاتے ہیں لیکن اصل چیز جو ہے، یہ (مسکرا کر) اخبار کی امّاں نیوز ایجنسی اس بچاری کا کوئی پوچھنے والا نہیں ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اپنی نیوز ایجنسی کے بغیر اخباروں کا وہی حال رہے گا جو اس بچے کا ہوتا ہے جسے ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوتا۔ اسی بچے کی طرح یہ ہمیشہ کم زور اور بیمار رہیں گے۔ خیر یہ داستان تو بہت لمبی ہے۔ اسے کب تک سناؤں۔ آپ سمجھیں گے آپ کا وقت خراب کر رہا ہوں، مگر اب واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس مسجد کو ناپاک لوگوں کے پنجے سے بچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

مولوی عبدالرحمان: مسجد کون سی؟

عبدالغفور: واہ مولانا دین کے عالم ہو کر ایسا سوال! میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر وہ جگہ جہاں مسلمان جمع ہو کر نماز پڑھا کریں وہی مسجد ہے خواہ وہاں کوئی عمارت ہو، یا نہ ہو، اور میرا خیال ہے کہ عام طور سے مسلمان سب یہی سمجھتے ہیں۔ شریعت کی رو سے مجھے یقین ہے کہ مسجد کی تعریف یہی ہوگی اور اس کے سوا اور کوئی ہو بھی نہیں سکتی۔ خیر تو آپ اگر اجازت دیں تو میں نے جو تدبیریں اس مسجد کو محفوظ رکھنے کی سوچی ہیں وہ آپ کو سمجھاؤں اور پھر آپ حضرات سے جس امداد کی توقع رکھتا ہوں وہ بھی عرض کر دوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہم دباؤ ڈال کر میونسپلٹی کو اس معاملے میں دخل دینے سے روک دیں۔ میونسپلٹی کو ایسے معاملوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں اور ممبران بورڈ پر یہ حقیقت

واضح ہونی چاہیے کہ غریب اور حقیر مسلمان گو اس کے پاس لنگوٹی کے سوا کچھ نہ ہو، اپنے مذہب کے معاملے میں کسی کی دولت اور جاہ وحشم کی پروانہیں کرتا اور اس معاملے میں دخل دے کر میونسپلٹی والے پچھتائیں گے۔ دوسری بات جو میں نے طے کی ہے یہ ہے کہ اس معاملہ کا مسلمانوں میں خوب چرچا کیا جائے تا کہ صرف اس شہر میں نہیں بلکہ کل ہندستان میں بچے بچے کو معلوم ہو جائے کہ دشمنوں نے اس کے دین وایمان کو نعوذ باللہ ذلیل کرنے کی کیسی تدبیریں سوچی ہیں۔ مولوی صاحب آپ کو تو صرف ایک فتوے کی تکلیف دوں گا کہ وہ جگہ جہاں مسلمان بڑی تعداد میں اور پابندی سے نماز کے لیے جمع ہوں، شریعت کی رو سے مسجد کہلائے گی۔ اور لوگوں کو اس جگہ نماز پڑھنے سے

زبردستی روکنا گویا ایک بنی بنائی مسجد کو توڑنا ہے (مولوی صاحب کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، مگر عبدالغفور انہیں موقع نہیں دیتا) اس میں تو غالباً آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ کرم علی صاحب! آپ کو بہت زیادہ زحمت دینے پر مجبور ہوں۔ آپ شہر کے سب سے ممتاز سوداگر ہیں اور تاجروں کی جماعت پر آپ کے برابر کسی کا اثر نہیں۔ خدا کے فضل سے آپ لوگوں میں دین داری بھی بہت ہے اور تجارت سے میونسپلٹی کو جو آمدنی ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سے آپ بورڈ پر جو اثر ڈال سکتے ہیں اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ اگر آپ تاجروں کی جماعت میں مسجد کی حفاظت کے لیے تحریک کریں اور ایک زوردار ریزولیوشن پاس کر کے ممبران بورڈ کی عقل درست کر دیں تو ملت کی آبرو رہ جائے گی۔ اس کے علاوہ اور درخواست ایک یہ ہے کہ ریزولیوشن کے ساتھ ہی آپ چندہ بھی جمع کیجیے۔ اگر آپ نے صرف ریزولیوشن پاس کر دیا تو اس کا کوئی خیال نہ کرے گا، لیکن اس کے ساتھ ہی دس پندرہ ہزار چندہ بھی جمع ہو گیا تو سب کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور سب کو یقین ہو جائے گا کہ آپ صرف باتیں ہی نہیں بناتے بلکہ میدان عمل میں بھی اللہ اکبر کہہ کر قدم رکھنے پر تلے ہوتے ہیں۔ (دلدار حسین کی طرف مخاطب ہو کر) دلدار حسین صاحب سے کیا کہوں میں نے انھیں سارا ماجرا اپنا اور ملت کا سنا دیا ہے اور میرا ارادہ ہے کہ سب کچھ انھیں کے سپرد کر دوں، وہ رئیس ہیں، بورڈ کے ممبر ہیں، سب کے محسن اور کرم فرما ہیں، ان کی بات کا سب کو خیال ہوگا۔ ان کی خواہش سب کے لیے ایک حکم ہے جس کو ماننے سے انکار کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ بہتر یہی ہے (دلدار حسین صاحب سے پھر مخاطب ہو کر) کہ میں سارا معاملہ آپ ہی کے سپرد کر دوں اور خود آپ کے حکم پر عمل کرنے کو حاضر ہو جاؤں۔

دلدار حسین: (کچھ روکھے پن سے) مجھے آپ معاف رکھے تو بہتر ہوگا۔ میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ ایسے ہنگاموں میں شریک ہوں۔

عبدالغفور: جی ہاں، یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں۔ آپ کی صحت واقعی ایسی ہے کہ آپ زیادہ دوڑ دھوپ کے کام نہیں کر سکتے۔ لیکن میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ آپ خود زیادہ زحمت فرمائیں، ہم کو تو صرف آپ کی سرپرستی درکار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ بھی اس تحریک میں پورے طور پر شریک ہیں۔ اور آپ نے بھی دین کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ باقی سب آپ ہم پر چھوڑ سکتے

ہیں۔ فی الحال اگر آپ اس اعلان پر جو میں شائع کرنے والا ہوں دستخط کر دیں اور بورڈ کے اگلے جلسے میں ایک ریزولیوشن پیش کر دیں کہ میونسپلٹی کا مذہبی معاملوں میں دخل دینا دستور کے خلاف ہے اور بھگوان ملز کے سامنے کی مسجد میں نماز بند کرنا خلاف قانون اور بڑے ظلم کی بات ہے تو کافی ہوگا۔ میرے خیال میں یہ دونوں کام زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ اعلان لکھا ہوا موجود ہے، ریزولیوشن کا مسودہ بھی آپ فرمائیں تو فوراً تیار ہوسکتا ہے، بس اس کے علاوہ.....

دلدار حسین: جی ہاں اعلان پر دستخط کرنا اور بورڈ میں ریزہ دلیوشن پیش کر دینا تو کوئی مشکل کام نہیں، لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ پہلے میں خود بھی اس معاملے میں تفتیش کرلوں پھر دیکھا جائے گا۔

عبدالغفور: تفتیش بڑی خوشی سے کیجئے، لیکن میں نے جو کچھ بتایا اس سے زیادہ آپ کو شاید ہی معلوم ہو سکے۔ بہرحال جیسا آپ مناسب سمجھیں۔

دلدار حسین: بہت اچھا، تو پھر اب مجھے، اجازت دیجئے۔

عبدالغفور: تشریف لے جائیں گے؟ بہت اچھا۔ (سب اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دلدار حسین سب کو خاموشی سے سلام کر کے چلا جاتا ہے) دیکھا آپ نے مولوی صاحب، ابھی چھپ کر تیسری شادی کی ہے۔ ذرا سا کام پڑا تو کہتے ہیں کہ صحت خراب ہے۔ (درد بھرے لہجے میں) سچ ہے مولوی صاحب اُونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے مگر امیر آدمی کا جنت میں داخل ہونا دشوار ہے۔ حضرت رئیس ہیں، بااثر ہیں، بہت اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ مگر کیا مجال جو ہم مذہبوں کی ذرا بھی خدمت کریں۔ کوئی ہندو اگر کچھ کہے تو فوراً کرنے کو تیار ہیں۔ مسلمان بچارا خوشامد کرے کہ میرا ابھی ذرا سا کام کر دو تو سیکڑوں اڑّنگے لگائیں گے۔ ہا، کتنے افسوس کی بات ہے مولوی صاحب! سب کچھ برداشت ہوسکتا ہے مفلسی، بھوک، پیاس، جسمانی تکلیفیں مگر جو چوٹ اپنوں کی سرد مہری اور عداوت سے دل پر لگتی ہے وہ نہیں سہی جاتی۔..... خیر تو کرم علی صاحب آپ تو ملت پر یہ احسان ضرور کریں گے کہ تاجروں کی انجمن کا ایک جلسہ کرا دیں اور اتنا چندہ جمع کرلیں کہ ہم غریبوں کی ہمت بندھ جائے اگر فتوے سے آپ کے کام میں مدد مل سکے تو مولوی صاحب اس کا بھی آپ کے لیے سامان کر دیں گے، تو مولوی صاحب، پھر رہے ایک زوردار فتوا۔ نہیں اب چند روز کے لیے بھول جایئے کہ آپ ایک یتیم خانے کے منتظم ہیں اور اس کام کو جو ملت کے لیے بہت زیادہ ضروری ہے کر ڈالیے۔

مولوی عبدالرحمان: (ڈرتے ڈرتے) جی ہاں، لیکن فتوا اگر صرف میرا نہ ہو بلکہ سارے علماء کی طرف سے جاری کیا جائے تو اس کا اثر بہت زیادہ ہوگا۔ میں لوگوں کی رائے دریافت کر کے جلد سے جلد آپ کو مطلع کر دوں گا۔

عبدالغفور: خیر آپ کی طرف سے تو مجھے بالکل اطمینان ہے۔ اگر اپنے سوا، میں کسی کے دل کی نسبت کہہ سکتا ہوں کہ وہ ملت کے سچے درد سے بھرا ہے تو وہ آپ کا ہے۔

کرم علی: (اٹھ کر) اچھا تو پھر اب اجازت دیجیے جو کچھ ہوسکتا ہے کروں گا۔

عبدالغفور: بہت اچھا السلام علیکم۔

مولوی عبدالرحمان: سلام علیکم

کرم علی: وعلیکم السلام (کرم علی دروازے پر ہے کہ حشمت اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے) ''عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں''؟ (اس کے بعد حشمت اللہ داخل ہوتا ہے، اس کے پیچھے عبدالقیوم، محمد حسین اور عبداللطیف آتے ہیں، عبدالغفور اور مولوی عبدالرحمان کو سلام کر کے بیٹھ جاتے ہیں)۔

عبدالغفور: (بڑے تپاک سے) کہو بھائی حشمت کیسے آئے (مسکرا کر) کوئی نئی خبر ہے؟

حشمت اللہ: (جس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہوگیا ہے) جی کچھ نہیں (عبدالقیوم اور اس کے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) آپ حضرات میرے یہاں تشریف لائے تھے کہ عبدالغفور صاحب سے ہماری مجلس میں تقریر کرنے کی گزارش کر دیجیے اس لیئے انھیں لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ تینوں حضرات یونی ورسٹی کے طالب علم ہیں اور آپ نے مسلمان طلبہ کی ایک مجلس قائم کی ہے جس کے آپ، عبدالقیوم صاحب صدر ہیں اور آپ محمد حسین صاحب سکریٹری، آپ کا اسم شریف عبداللطیف ہے۔ تینوں ماشاءاللہ بہت ہونہار طالب علم ہیں اور آپ کے پیرو بننے کے بہت مشتاق اگر فرصت ہو تو کوئی تاریخ مقرر کر دیجیے۔

عبدالغفور: (مولوی عبدالرحمان صاحب سے مخاطب ہو کر اور حشمت اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مولوی صاحب، ہم کو تو بس ایسا آدمی پسند ہے۔ اپنا کام اس پابندی اور سلیقے سے کرتے ہیں کہ برابر ترقی ہوتی رہتی ہے اور پھر ساتھ ساتھ ہر قومی مسئلے سے دلچسپی بھی ہے اور ہر وقت اپنی سی کرنے پر آمادہ بھی رہتے ہیں (طالب علموں سے مخاطب ہو کر) ہاں بھائی، تم جب بھی کہو ہم آنے پر راضی ہیں۔ اب تو کچھ صورت ایسی ہوگئی ہے کہ جتنی تقریریں ہوں اور جتنا شور مچھے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم بالکل بے بس اور بے زبان ہیں اور ان کو دکھانا ہے کہ اُن کا یہ خیال سراسر غلط ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ تم لوگوں نے اپنی مجلس قائم کی ہے، بہت اچھا ہے، تم مسلمان ہو، نوجوان ہو، تم جتنا ہاتھ پیر مار کر اپنی اہمیت اور اپنے جوش کا احساس اپنے اور دوسرے کے دلوں میں پیدا کرو، اتنا اچھا ہے، اچھا تو پھر میری طرف سے وعدہ ہے، جب کہو آ کر میں تقریر کروں گا اور انشاءاللہ تمھارا جوش دگنا ہو جائے گا۔ میں منمنانے کا تو قائل نہیں، جب بولتا ہوں تو کڑک کر بولتا ہوں۔

تیسرا سین

ایک بڑا کمرہ، داہنی طرف ایک بڑی میز بچھی ہے جس کے دائیں طرف تین کرسیاں رکھی ہیں۔ میز سے تھوڑے فاصلے پر اسٹیج کے بیچ میں اور بائیں حصے میں کرسیوں کی بے ترتیب قطاریں ہیں۔ جلسہ ابھی ختم ہوا ہے میز کے قریب عبدالقیوم، محمد حسین اور عبداللطیف کھڑے ہیں۔......حسام الدین اور حشمت اللہ اسٹیج کے بائیں جانب سے سامنے آتے ہیں۔

حشمت اللہ: (عبدالقیوم سے مخاطب ہوکر) کہیے آپ کو تقریر پسند آئی ؟ دیکھئے یہ حسام الدین صاحب گھنٹوں سے میرے پیچھے پڑے ہیں۔ کہتے ہیں تقریر بالکل مہمل تھی۔ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور ہر سمجھ دار آدمی کو جب کہیں بدقسمتی سے ایسی تقریروں سے بچنے کی اور کوئی صورت نہ ہو تو کان میں روئی ٹھونس لینا چاہیے۔

عبدالقیوم: (حسام الدین کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر) میں نے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونسی نہیں۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تقریر نہایت دل چسپ اور ہمت افزا تھی یوں تو ''فکر ہر کس بقدر ہمت اوست'' (ہر آدمی کا خیال اس کی ہمت اور حوصلے کے مناسب ہوتا ہے۔) عبدالغفور صاحب پر اس کا الزام کیوں لگایا جائے؟

حسام الدین: بالکل بجا فرمایا۔ مجھے امید ہے آپ کی بلند حوصلگی قوم کو بہت جلد مردانگی سکھا دے گی۔

عبدالقیوم: جناب میں نے اپنی نسبت تو کوئی دعوا کیا نہیں تھا۔ صرف اتنا عرض کیا تھا کہ عبدالغفور صاحب کی تقریر بہت ہمت افزا تھی۔

حسام الدین: جی ہاں میرا مطلب بھی یہی تھا، آپ میں ہمت تھی اور عبدالغفور صاحب نے اسے دوبالا کر دیا .... حشمت صاحب مجھے لگی ہے گنواروں کی سی بھوک، آپ جلدی سے گھر چل کر مجھے کچھ کھلائیے ورنہ ....

عبدالقیوم: امید ہے جو قوت آپ کی تقریر سے نہیں پیدا ہوئی وہ پیٹ بھر کر کھانے سے ہو جائے گی۔

حسام الدین: جی ہاں، انشاءاللہ (حشمت اللہ کا ہاتھ پکڑ کر) بس اب چلیے حضرت! (دونوں چلے جاتے ہیں)

عبداللطیف: واہ بھائی، ایسا بھی فرمایشی گنوار آج تک نہیں دیکھا تھا!

محمد حسین: آخر جب ان لوگوں کے دماغ میں کوئی بات دھنستی نہیں تو پھر یہ تقریریں سننے کا حوصلہ کیوں کرتے ہیں؟

عبدالقیوم: اسی کا تو عبدالغفور صاحب دکھڑا رویا کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو ذرا بھی ترقی کی خواہش ہوتی ہے اُن لوگوں کو یہ جانوروں کی سی سمجھ اور گنواروں کی سی بھوک پست کر دیتی ہے۔ کہاں عبدالغفور صاحب کی تقریر، کہاں حسام الدین صاحب کی سمجھ، تعلیم کچھ بھی نہیں، دل مردہ ہے۔ بھوک کے سوا کسی چیز کا احساس نہیں۔ چلے عبدالغفور صاحب پر نکتہ چینی کرنے .... اچھا سنو بھائی محمد حسین اس تقریر کا ایک خلاصہ اخباروں میں بھیجنا ہے، اسے تیار کر لینا چاہیے اور تقریر کے بعد ہم نے عبدالغفور صاحب کی تعریف میں جو کچھ کہا تھا وہ بھی اگر چھپ جائے تو وہ ہم سے خوش ہو جائیں گے۔ (پردہ)

دوسرا ایکیٹ

پہلا سین

دلدار حسین صاحب کے مکان کا ایک کمرہ جدید طرز پر آراستہ داخلے کا دروازہ سامنے ہے۔ دلدار حسین داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے خادم۔

دلدار حسین: (ادھر ادھر دیکھ کر) کہاں ہیں وہ صاحب؟

خادم: باہر میں حضور۔ ابھی بلاتا ہوں (خادم چلا جاتا ہے اور دلدار حسین ایک تھکے ماندے آدمی کے انداز سے ایک کوچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں عبدالقیوم اندر آتا ہے اور نوکر جو اسے پہنچانے آیا ہے دروازے سے واپس چلا جاتا ہے)

عبدالقیوم: (بہت جھک کر) آداب عرض کرتا ہوں۔

(دلدار حسین بغیر منہ سے بولے سلام کا ہاتھ سے جواب دیتا ہے اور پاس ایک کوچ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عبدالقیوم، دلدار حسین کو ایک سفارشی خط دے کر کوچ کے سرے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بیٹھنے کا طریقہ بہت بے ڈھنگا ہے اور وہ گھبرایا ہوا ہے)

دلدار حسین: (خط پر ایک سرسری نظر ڈال کر) جی فرمایئے۔

عبدالقیوم: جناب کو خط سے میری نسبت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں نے بی۔ اے پارسال فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس وقت ایم۔ اے میں پڑھ رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے میونسپلٹی کے صدر دفتر میں ایک جگہ خالی ہوئی ہے جس کے لیے ایک، پی۔ اے کی ضرورت ہے۔ استعداد آپ کو خط سے معلوم ہو گئی ہوگی۔ اگر آپ تھوڑی سی تکلیف فرمائیں اور میری سفارش کر دیں تو بڑی عنایت ہوگی اور میں تمام عمر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ اس جگہ کے لیے امیدوار تو بہت ہوں گے لیکن میرا حق کسی سے کم نہیں اور اگر آپ میری سفارش کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا۔

دلدار حسین: آپ کی علمی استعداد کا مجھے اس خط کے علاوہ اور ذریعوں سے بھی علم ہو گیا ہے، اور مجھے جو ذرا سا تامل ہے وہ اسی وجہ سے، ایسی ملازمت تو ہرگز آپ کے شایان شان نہیں۔ کہاں آپ اور کہاں یہ ڈیڑھ سو کی نوکری۔

عبدالقیوم: (کچھ پریشان ہو کر) میں سمجھا نہیں۔ جناب نے.....

دلدار حسین: موٹی سی بات ہے۔ نوکری وہ بچارے کرتے ہیں جن میں کسی قسم کی قابلیت نہیں ہوتی اور جن کے دلوں میں قومی درد کی گرمی نہیں ہوتی۔ آپ کے سامنے ایک نہایت ہمت افزا مثال موجود ہے جس سے آپ اپنی قابلیت کا استعمال کرنا بہت اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے تو غالباً ایک جلسے میں اعلان بھی کیا تھا کہ ہر مسلمان کو جو دل میں درد رکھتا ہے چاہیے کہ عبدالغفور صاحب کی پیروی کرے اور انھیں کی طرح اپنی جان اور اپنے مال کو قوم پر صدقہ کر دے۔ بس آپ نے جو کچھ کہا تھا وہی کیجیے، نوکری پر لات ماریئے۔

عبدالقیوم: جی ہاں مجھ سے غلطی تو ہوئی، مجھے اس جلسے کی صدارت ہی منظور نہ کرنا چاہیے تھی مگر کیا کرتا۔ لوگوں نے ایسا مجبور کیا اور جب صدر ہوا تو مروت میں خواہ مخواہ عبدالغفور صاحب کی تھوڑی بہت تعریف کرنی ہی پڑی۔ ورنہ میں ہرگز ان کا معتقد نہیں۔ میں محنت کر کے روزی کمانے کو سنت رسول سمجھتا ہوں اور جس طرح عبدالغفور صاحب لوگوں سے قوم کے نام پر چندہ مانگ مانگ کر اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں وہ میرے نزدیک کسب حلال نہیں، اس لحاظ سے تو ان کی پیروی کرنا ایک اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔

(خادم اندر آتا ہے)

خادم: حضور کرم علی صاحب اور مولوی عبدالرحمان صاحب تشریف لائے ہیں۔

دلدار حسین: (مسکراتے ہوئے) اچھا تو انھیں یہیں بلا لاؤ (عبدالقیوم سے) جناب میں پچھلے پندرہ سال کے عرصے میں اکثر بورڈ کا ممبر رہا ہوں اور بہت سے لوگوں کی سفارشیں کر چکا ہوں اور نوکر ہونے کے بعد ان کا رویہ بھی میری نظروں کے سامنے رہا ہے۔ آپ کو نوکر رکھوا کر مجھے سخت پریشانی ہوگی۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ آپ کی قوم پرستی مجھے کھلتی ہے۔ آپ سچے قوم پرست ہوتے تو میں آپ کے لیے جی توڑ کوشش کرتا، مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ دبو، خوشامدی اور نا قابل اعتبار ہیں۔ آپ اپنے افسروں میں ایک کی دوسرے سے برائی کیا کریں گے، آپ پر جس نے بھروسا کیا وہ دھوکا کھائے گا اور پچھتائے گا۔ ممکن ہے دنیا میں زیادہ لوگ آپ ہی جیسے ہوں لیکن میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ خدا حافظ!

(مولوی عبدالرحمان اور کرم علی داخل ہوتے ہیں۔ عبدالقیوم کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ان لوگوں کو دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ دونوں دلدار حسین سے سلام علیکم کہہ کر اس کے اشارے پر بیٹھ جاتے ہیں)

دلدار حسین: (عبدالقیوم سے) بس اب تشریف لے جایئے۔ اگر آپ نے اس سبق سے فائدہ اٹھایا اور وفاداری اور استقلال کی قدر پہچان لی تو آپ کے لیے بہت سی نوکریاں خالی ہو جائیں گی۔ (عبدالقیوم چلا جاتا ہے)

فرمایئے مولوی صاحب آپ تو اسی چکر میں ہوں گے۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں!

دلدار حسین: میں بھی اسی میں مبتلا ہوں۔ کل بھگوان داس صاحب تشریف لائے شکایت کرنے لگے کہ ان سے مشورہ کیے بغیر میں عبدالغفور صاحب کی تحریک کا حامی کیوں بن گیا اور دو سو روپے چندہ کیوں دے دیا۔ میں نے کہا میں اس تحریک میں ہوں، نہ اس کی مالی امداد کی ہے۔ تب انھوں نے اخبار دکھایا۔ اس میں میرا نام اور نام کے آگے دو سو چندہ وصول ہونے کی اطلاع شکریے کے ساتھ تھی۔ میں حیران ہوا۔ اور سوچتا رہا کہ آخر یہ کس نے میرے نام سے چندہ داخل کیا۔ اتفاق سے خیال آ گیا۔ عبدالغفور صاحب کا آدمی دوا فروشوں کے بل لے کر میرے پاس آیا تو اس کے ساتھ عبدالغفور صاحب کا ایک خط تھا، جس میں انھوں نے بلوں کی ادائیگی میں مدد دینے کی التجاء کی

تھی میں نے سوچا تحریک سے الگ رہنے کی بنا پر وہ مجھ سے بہت خفا ہوں۔ اگر ان کی مدد کروں تو شاید اسے ایک ذاتی احسان سمجھ کر رام ہو جائیں، مگر انھوں نے جناب اسے چندے میں شامل کرلیا۔ اگر میں کبھی پوچھوں تو کہہ دیں گے کہ بھائی کیا کرتا لوگ آئے تھے میرے پاس ان دوسو کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس لیے اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے روپیا دے دیا۔ تم تو جانتے ہو کہ قومی اغراض کے سامنے میں اپنی ضروریات کا خیال کر ہی نہیں سکتا وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے تو اپنا کام بہت صفائی سے نکال لیا۔ چندے کا اعلان کر کے مجھے اپنی تحریک میں پھنسا دیا اور اپنے بل بھی ادا کر دیے۔ لیکن آپ یہ بتایئے کہ میں بھگوان داس صاحب سے کیا کہتا۔ کچھ عذر کرتا تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتے اور یہ کہتا کہ تحریک میں شریک ہوں تو بات جھوٹی ہوتی۔ عبدالغفور صاحب کو بدنامی سے بچانے کے لیے میں بہت صدمے اٹھا چکا ہوں۔ اب زیادہ نیازمندی ممکن نہیں۔ اس لیے میں نے بھگوان داس کو سب کچھ سمجھا دیا اور ان سے التجا کی کہ میری صفائی میں بھی اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کریں، خیر میرا تو ذاتی معاملہ ہے مگر آپ تو یتیم خانے کے کاموں میں ایسے ڈوبے رہتے ہیں کہ دنیا کی خبر تک نہیں ہوتی۔ آپ کو اس جھگڑے میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

عبدالرحمان: کیا بتاؤں بری طرح پھنسا ہوں۔ میں واقعات دریافت کرنے اور علماء سے مشورہ لینے میں مشغول تھا کہ ایک روز میرے نام سے ایک بہت زوردار فتوا شائع ہو گیا۔ کس کس کو سمجھاتا کہ یہ سب جعل سازی ہے۔ عبدالغفور صاحب کی مروت میں چند دوستوں کے سوا کسی سے کچھ نہیں کہا اور اب ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ تحریک سے کیسے الگ رہوں، جلسوں میں شریک نہ ہونے کے کیا عذر پیش کروں، جس جہاد کی میرے نام سے دھمکی دی گئی ہے اس کو کیسے سمجھاؤں۔ عجیب جھمیلے میں پڑ گیا ہوں۔

دلدار حسین: (مسکرا کر) جی ہاں، حالت آپ کی بے شک قابل رحم ہے، مگر آپ جیسے بامروت اور راست باز لوگوں کا عبدالغفور صاحب کے پنجے سے بچنا مشکل ہے انہیں عرصہ کے بعد اپنا جوش ظاہر کرنے اور چندہ وصول کرنے کا بہانہ ملا ہے اور وہ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ مسلمانوں کی فطرت کچھ ایسی ہے اور معاشی حالت ایسی کہ وہ زندگی، خاص طور سے سکون کی زندگی سے بے زار رہتے ہیں۔ انہیں نشے کی حاجت ہوتی ہے اور عبدالغفور صاحب نشہ بہت سستا بیچتے ہیں۔ ہم اور آپ اگر کسی سے کہیں کہ بھائی اس جنگ میں فتح اسی کی ہے جو استقلال اور تن دہی سے اپنے کام پر جٹا رہے تو وہ سمجھے گا کہ ہمیں بنیوں نے خرید لیا ہے اور اب ہم صرف بنیوں کی سی بات کہہ سکتے ہیں۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں مجھے اپنی عمر میں صرف ایک ایسا آدمی ملا ہے جو سچے دل سے اس کا قائل ہے اور وہ ہے میرا شاگرد حسام، آپ بھی اسے جانتے ہوں گے۔ دو سال تک وہ عبدالغفور کا ملازم بن کر رہا، اس وجہ سے نہیں کہ ان کے فریب میں آ گیا تھا اور اصلیت سے واقف نہیں تھا بلکہ محض اس لیے کہ ایسا اور کوئی شخص اسے نظر نہیں آتا تھا جو اس کی خدمت اور ایثار کی پیاس بجھانے کا وعدہ کرئے، لیکن آخر میں وہ بے زار ہو کر چلا گیا۔ اب وہ گانو میں ہے اور جسے دیکھنا ہو کہ کام کرنے والے کیسے کام کرتے ہیں وہ اس کے گانو

میں چلا جائے۔ وہاں کی صفائی، کاشت کاروں کی خوش حالی اور زمیندار کی نیک نیتی اور ہمدردی پر ان کا اعتبار۔ اس کا چھوٹا سا اسکول دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی تو مجھے یہ ہے کہ اس نے گانّو کی عورتوں کو وہ فن سکھا دیا ہے جسے وہ برسوں سے بھولی بیٹھی تھیں۔ اب آپ جس گھر کے پاس سے گزریں گے اس میں سے چرخے کی آواز آتی ہے اور کتے ہوئے سوت کے ڈھیر ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔
حسام الدین آٹھ سال سے ہمہ تن اس کام میں مصروف ہے۔ سارا وقت، ساری آمدنی اور سارے دنیاوی حوصلے اسی کی نذر کر دیتے ہیں .....اور دیکھئے.....

دلدار حسین: جی ہاں، حسام الدین کے استقلال کی میں بھی آزمائش کر چکا ہوں۔ کسی سے کہیے گا نہیں۔ میری لڑکی سے اس کی نسبت کی بات چیت ہو رہی تھی اور میں نے اس کے واسطے ایک بہت اچھی ملازمت بھی تلاش کر لی تھی، مگر اسے یہ اندیشہ تھا اور بالکل بجا کہ رئیس گھرانے میں شادی کرنے سے اس کا کام بگڑ جائے گا اور اس نے انکار کر دیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا، لیکن حسام الدین سے کوئی شکایت میرے دل میں نہیں اور اب بھی جب اس کا ذکر کرتا ہوں تو تعریف کی غرض ہے۔

کرم علی: میں نے تو سنا تھا کہ اُس کی نسبت عبدالغفور صاحب کی ایک لڑکی کے ساتھ ٹھہری ہے۔

مولوی عبدالرحمان: (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) خیر صاحب ایسی باتوں کو کسی اور موقع کے لیے رکھیے۔ ہم دونوں آپ سے یہ گزارش کرنے کے لیے آئے ہیں کہ کل بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔ اس کی آپ صدارت قبول فرمائیں۔ ہم کو یہ غلط فہمی ہرگز نہیں کہ آپ اس تحریک سے ذرا بھی ہمدردی رکھتے ہیں، ہم صرف اس خیال سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ شاید آپ کی موجودگی سے عبدالغفور صاحب اور اہل جلسہ کے جوش کے بھڑک اٹھنے کی نوبت نہ آئے۔ ہماری بات تو کوئی نہ سنتا ہے اور نہ سنے گا۔

دلدار حسین: میں اس معاملے میں آپ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہوں، میرے تعلقات کچھ ایسے ہیں کہ میں جلسے میں آ بھی نہیں سکتا۔ عبدالغفور صاحب میری شرکت کا اعلان کر دیں، لیکن میری صحت اچھی نہیں ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر جلسے کے وقت میں پلنگ پر پڑ رہوں اور میرے کمرے میں ایک ڈاکٹر بیٹھا ہو جو میرے لئے منہ سے بات کرنا بھی نہایت خطرناک قرار دے۔

کرم علی: جناب بہت خوش قسمت ہیں جو ایک اصلی مصیبت سے بچنے کے لئے ایک نقلی مصیبت میں پناہ لے سکتے ہیں، مگر ہم بتائیے کیا کریں؟

دلدار حسین: آپ اطمنان سے جلسے میں شریک ہوں، عبدالغفور صاحب آپ کی طرف سے جو وعدے کریں اور جو دھمکیاں دیں انہیں خاموشی سے سن لیجئے اور انہیں پورا کرنے کا حق محفوظ رکھئے۔

کرم علی: مگر اس سے ہم خواہ مخواہ جھوٹے بنتے ہیں اور لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے سوا کسی کی فکر نہیں، ہم کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتے۔ وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ بے مروت ہیں۔

دلدار حسین: خیر اگر اتنا ہی ہوتا تب بھی غنیمت تھا مگر غضب تو یہ ہے ہندوؤں میں بھی عبدالغفور صاحب جیسے بہت سے قوم کے خیر خواہ پیدا ہو گئے ہیں جو عبدالغفور صاحب کی حرکتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور عبدالغفور صاحب کی بدولت ان بچارے ہندوؤں کے منہ بند ہو جاتے ہیں جو کسی طرح کا فساد نہیں چاہتے اور ہم سے بھائی چارہ کرنے پر تیار ہیں..... جو شکایت آپ کر رہے ہیں وہ میں نے بہت سے ہندوؤں سے بھی سنی ہے ہندو انھیں غدار سمجھتے ہیں۔..... مسلمان انھیں دشمن۔ حالانکہ وہ بچارے دل سے دونوں کے خیر خواہ ہیں۔ میں خود تیس سال سے اپنی نسبت یہی رائے سن رہا ہوں۔ پہلے لوگوں کو سمجھانا چاہا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اب بالکل بے حس ہو گیا ہوں۔

مولوی عبدالرحمان: معاذ اللہ ہمارے دلوں کو بھی کیسا روگ لگ گیا ہے، ذہن میں زہر سرایت کر گیا ہے

دلدار حسین: (مسکرا کر) جی ہاں مولانا یہ سب قومی درد سے نا آشنائی کا نتیجہ ہے۔

(خاموشی) **کرم علی:** تو پھر آپ جلسے کی صدارت پر راضی نہیں۔

دلدار حسین: بالکل مجبور ہوں۔ میں ویسے بھی اپنی مرضی کے بغیر تحریک میں پھنسا دیا گیا ہوں۔ اگر جلسے میں گیا تو اپنے دوست احباب کو منہ دکھانا دشوار ہو جائے گا۔

کرم علی: خیر مولوی صاحب، تو پھر چلیے، کسی اور سے گزارش کریں۔

مولوی عبدالرحمان: چلیے (مضافہ کر کے سلام علیکم وعلیکم السلام کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(دلدار حسین چھت کی طرف دیکھ کر لمبی سانس لیتا ہے) (پردہ)

دوسرا سین

بازار میں کرم علی کی دوکان۔''کرم علی جنرل مرچنٹ''ایک لمبے سرخ تختے پر سفید رنگ سے لکھا ہوا ہے، دکان میں بیوپار کا سامان کچھ کھلا، کچھ بادامی کاغذ میں لپٹا ہوا رکھا ہے۔ دکان میں بائیں طرف سامنے کرم علی بیٹھا ہے اس کے پیچھے ایک منشی، جس کے آگے نیچی میز پر حساب کی کتابیں رکھی ہیں راہ رو سامنے سے گزرتے ہیں۔

مولا بخش: (دائیں طرف سے آتا ہے اور السلام علیکم کہہ کر کرم علی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

کرم علی: ہاں بھائی تو کیا کیا بنا کر لائے تھے؟

مولا بخش: جناب ایک تو وہ بکس جو پچ گیا تھا ٹھیک کیا ہے، چھے چھریاں تیز کی ہیں۔ دو قینچیوں پر دھار لگائی ہے، اور ایک وہ موٹی سلاخ سیدھی کی ہے۔ اس کام کی اجرت اور چیزیں لے جانے کی مزدوری سب پانچ روپے ہوتی ہے۔ میں چیزیں سب کل شام کو دے گیا تھا اور مجھ سے کہا گیا تھا دس بجے سویرے آنا تو دام مل جائیں گے۔ اگر آپ جلدی سے دے دیں تو بڑی عنایت ہوگی، مجھے بہت سخت ضرورت ہے۔

کرم علی: یہ نہیں کہتا ہوں کہ تمھیں روپے کی ضرورت نہیں مگر تمھیں جو کچھ بنانے کو دیا گیا تھا وہ تم اور خراب کر لائے ہو۔ منشی جی ذرا وہ بکس اور چھریاں اور قینچی جو یہ کل دے گئے تھے اٹھا تو لاؤ (منشی اُٹھ کر اندر سے بکس لے آتا ہے جس میں اور چیزیں رکھی ہیں۔ کرم علی بکس کھول کر سب چیزیں مولا بخش کے سامنے رکھ دیتا ہے) یہ چھریاں تیز کرنے کو دی گئی تھیں۔ تم نے سان پر دھر کر ایسا رگڑا ہے کہ سب کا پھل آدھے سے زیادہ گھس گیا ہے اور اس پر دھار کا حال یہ ہے کہ برسوں کے رگڑو، تب بھی کچھ کاٹے نہ کٹے۔ پھر قینچی کو ذرا دیکھو، یہ بھلا کپڑا کاٹنے کے کام کی رہ گئی ہے؟ اور بکس تو ماشاءاللہ ہتھوڑے کا نشان دُور سے معلوم ہوتا ہے، اور لطف پر لطف یہ کہ جوں کا توں پچخا رہا۔ سلاخ اندر رکھی ہے، پہلے ایک طرف کو مڑی تھی، اب دوسری طرف جھک گئی ہے سارا سامان اکارت گیا۔ اوپر سے پانچ روپے ڈنڈ دیجیے۔

مولا بخش: اچھا صاحب کچھ نہ دیجیے۔ معلوم ہوتا کہ آپ ایسے معاملے کے خراب ہیں تو بے کار کی محنت سے بچتی۔

کرم علی: ایسی محنت کی جس سے چیز اور خراب ہو جائے، جو اجرت ہے وہ لے لو۔

مولا بخش: تو آخر آپ کیا دینا چاہتے ہیں؟

کرم علی: میں تو ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا۔ تم سے چیزوں کی قیمت نہیں مانگتا۔ یہی تم پر احسان ہے۔

(مولا بخش غصے میں دکان کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے تک داڑھی کھجاتا اور سوچتا رہتا ہے۔ حسام الدین سڑک پر سے گزرتا ہے کرم علی سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور وہ ادھر ادھر دیکھ کر دکان پر آ جاتا ہے)

کرم علی: کہئے، مولانا کیسے تشریف لائے، آپ تو ایسے گانّو میں منہ چھپا کر بیٹھے ہیں کہ کبھی نیاز حاصل ہی نہیں ہوتا۔

حسام الدین: ارے صاحب جا کے کیا بیٹھا ہوں، بس اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دے رہا ہوں۔ نام ہے کہ بن باس لیا ہے اور جب دیکھئے شہر میں جوتیاں چٹخا تا پھرتا ہوں، یہاں سب کہتے ہیں کہ ہمیں کبھی نظر نہیں آتے، گانّو میں الزام لگایا جاتا ہے کہ شہر کا ایسا چسکا لگا ہے کہ گانّو میں قدم جمنے نہیں پاتے۔ اب کس کس کو سمجھاؤں، بدنامی تو ہر صورت سے ہے۔

کرم علی: معاف فرمایئے گا۔ میں نے شکایت تو نہیں کی تھی، نہ آپ کا دل دکھانا چاہتا تھا بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی اس لیے عرض کیا تھا اور اس میں بدنامی کی کیا بات ہے۔ جہاں جی لگے رہیں خوش رہیے۔

حسام الدین: نہیں صاحب بدنامی ہے اور اگر آپ یقین نہ کریں تو میرے ساتھ چلئے عبدالغفور صاحب کو تقریر کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ مجھے جو کچھ ابھی ابھی سنایا ہے وہ خوشی سے دہرا دیں گئے، اور اس کے بعد پھر آپ کو دلدار حسین صاحب کی خدمت میں پہنچا دوں گا، انھیں کبھی مشورہ دینے میں تامل نہیں ہوتا اور انہوں نے مجھے جو بزرگانہ تنبیہہ کی ہے، وہ بھی سن لیجئے گا اور فساد کی جڑ یہ ہے کہ میرا لوٹا چوری ہو گیا اور نیا خریدنے آیا ہوں جس کی وجہ سے ناحق ان بکھیڑوں میں پڑا۔

کرم علی: جی ہاں، عبدالغفور صاحب نے تو کچھ ایسی تحریک شروع کی ہے.....

مولا بخش: ہاں صاحب تو پھر ایسے ہی کھڑا رہوں؟

کرم علی: جیسا جی چاہے۔ میں نے تو تمھیں روکا نہیں۔

مولا بخش: (غصے سے کانپتے ہوئے) اچھے آئے، روکا نہیں، روکا نہیں۔ خواہ مخواہ غریب آدمی کو حیران کرتے ہیں اور اوپر سے باتیں بنانے پر تیار ہیں۔

کرم علی: سنو میاں، بدزبانی سے بگڑا کام تو بنتا نہیں، اور زیادہ کچھ کہو گے تو تھانہ قریب ہے دونوں چلے جائیں گے۔

مولا بخش: اجی دھمکی کیا دیتے ہو، تھانے میں جا کر میرا کیا بنا لو گے؟ خدا کی قسم بازار بھر میں بدنام نہ کیا تو میرا نام مولا بخش نہیں، اور پھر دیکھئے گا جو کوئی بھولے سے بھی آپ کا کام کرنے پر راضی ہو جائے۔

کرم علی: (حسام الدین سے) دیکھئے جناب مسلمان بھائی سمجھ کر ذرا سا کام دیا تھا، سو وہ سارا چوپٹ کیا۔ اب اُلٹے دھمکی دیتے ہیں کہ بازار بھر میں بدنام کروں گا (مولا بخش سے) خیر بھائی بدنام ہی کر لو۔

مولا بخش: مگر آپ دام نہ دیں گے۔

حسام الدین: ارے میاں دام مانگ رہے ہو، یا ڈاکہ ڈالنے آئے ہو۔ یہ آخری طریقہ کیا ہے؟

مولا بخش: جناب طریقہ وریقہ تو میں جانتا نہیں، میں نے کام کیا ہے اور اس کے دام چاہتا ہوں۔

حسام الدین: اور ظاہر ہے جب اسی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر دام مانگنا پڑ رہا ہے تو تم نے کیسا کام کیا ہو گا۔ کام اچھی طرح کیا ہوتا تو

کرم علی صاحب خود تمھارے گھر دام دینے کو پہنچتے اور شوق سے ایک کے دو دیتے۔

مولا بخش: اجی یہ، انہیں موقع ملے تو آدمی کا خون تک پی جائیں۔ ان کے لیے اچھا کام کرنے میں خوشی کیا۔ اچھا کرو یا برا، یہ حجت کئے بغیر تو کبھی کچھ دیتے نہیں۔ انھیں اپنا پیسا بچانے سے مطلب ہے۔ ہماری آبرو رہے یا نہ رہے۔

حسام الدین: جانے دو میاں آبرو آدمی خود کھوتا ہے۔ کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔

مولا بخش: اچھا صاحب ہم بے آبرو سہی مگر ہمارے دام تو دلوا دیجیے۔

حسام الدین: میں کیوں دلوا دوں؟

مولا بخش: اس لیے کہ آپ نے ہمیں غریب سمجھ کے ڈانٹ دیا تو اُدھر بھی تو کچھ کہیے۔ ہم داموں کے لیے تقاضا کریں تو ہمارا قصور، کام میں ذرا بھی نقص رہ جائے تو ہم ذمہ دار، بیوی بچوں کو کھانے کو نہ ملے تو ہمارے سر مصیبت۔ آخر ہم اپنا پیٹ کیسے پالیں؟ ہمارے لیے بھی تو کوئی سہارا ہونا چاہیے۔

کرم علی: ارے بھائی ان بیچارے سے کیوں حجت کر رہے ہو کام میں نے کرایا ہے، جو کچھ دوں گا میں دوں گا۔

مولا بخش: آپ سے ملنے کی اُمید ہوتی تو میں کیوں کسی کی خوشامد کرتا۔

کرم علی: اچھا دیکھو، تم نے جن چیزوں کی مرمت کی ہے وہ میں سب ان صاحب کے سامنے رکھے دیتا ہوں، پھر جو کچھ یہ کہیں دے دوں گا۔

حسام الدین: نہیں صاحب، اس سے فائدہ کیا، اس کو تو دے ہی دیجیے۔

کرم علی: کیا؟

حسام الدین: جو کچھ مانگے۔

کرم علی: (کچھ بے مروتی سے مسکرا کر) اگر منہ مانگے دام ملنے کی اُمید ہوئی تو یہ تو میری دکان ہی بکوائے گا۔

حسام الدین: مگر اس چکر سے تو کسی طرح نکلنا ہی چاہئے۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ یہ آپ کی دکان بکوا لے گا، اسے خوف ہے کہ آپ اس کا خون چوس لیں گے اور دونوں کی بدظنی میں کام چوپٹ ہوتا ہے، ہنر سارے بے قدری کی وجہ سے ہٹے جا رہے ہیں۔ میں تجارت سے واقف نہیں۔ لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ ہنر کی قدر نہ کیجئے تو استاد بھی اناڑی سے بدتر کام کرتا ہے۔

مولا بخش: ہاں صاحب یہ بات آپ نے ہمارے دل کی کہی۔ ہم کو یقین ہو کہ ہمارے کام کی قدر ہوگی تو ہم محنت کرنے پر تیار ہیں، ذرا ذرا سی بات پر اپنے ہنر کی لاج رکھنے کے لیے جان کھپا دیں گے، لیکن صاحب ہم محنت سے شوق سے کام کر کے لائے اور یہاں ہوا مول تول تو ہم میں تو پھر ہمت رہتی نہیں۔

کرم علی: اجی باتیں کیوں بناتے ہو۔کبھی کچھ سلیقے سے کیا بھی ہے کہ یوں ہی خواہ مخواہ تمہاری پیٹھ ٹھوکا کریں۔

مولا بخش: (کرم علی کو گھور کر) جناب آپ کو دام نہیں دینا ہیں تو نہ دیجئے۔میرا منہ بند کرنے کی فکر کیوں کر رہے ہیں۔.....

لاحول ولاقوۃ لعنت ہے اس پیشے پر، اور ان کمینوں پر، جن سے سابقہ پڑتا ہے۔آخ تھو۔.....(مولا بخش تھوک کر چلا جاتا ہے۔

حسام الدین لمبی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

(پردہ)

تیسرا ایکیٹ

پہلا سین

عبدالغفور کا کمرہ- آرایش جیسے پہلے ایکٹ، دوسرے سین میں، پردہ اٹھنے پر حسام الدین فرش کے ایک کونے پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے، تھوڑی دیر بعد عبدالغفور داخل ہوتا ہے۔ حسام الدین اٹھ کر نہایت خون زدہ لہجے میں سلام کرتا ہے۔

عبدالغفور: (حسام الدین کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر) وعلیکم السلام، وعلیکم السلام، خیر بھائی آ گئے، اتنا تو احسان کیا، مجھے تو لوگوں نے ایسا ڈرایا تھا، میں سمجھا تم آنے ہی سے انکار کر دو گے۔ خیر آ گئے ہو تو تم سے مشورہ لینے کا موقع تو مل گیا۔

حسام الدین: (مسکرا کر) بھلا میری ہستی کیا ہے جو آپ کی اطاعت سے کبھی انکار کروں۔ مگر یہ مشورہ لینے کی تدبیر آپ نے خوب سوچی اور مشیر بھی ماشاءاللہ بہت اچھا منتخب کیا۔

عبدالغفور: کیوں بھائی۔ میں کوئی نئی بات تھوڑی ہی کر رہا ہوں۔ میرا تو ہمیشہ یہی اصول رہا ہے کہ جو کچھ کرتا ہوں لوگوں سے مشورہ لے کر کرتا ہوں، خاص طور پر ان نوجوانوں سے جن کی کوششوں کے بغیر میرا کچھ بس نہیں چل سکتا۔ اب اس کے لیے میں کیا کروں کہ تم دنیا کو چھوڑ کر جانوروں کی طرح بل میں گھس کر بیٹھ رہے اور کسی کو منہ تک نہیں دکھاتے، خیر بھائی سنو، مسجد پر ہندوؤں کے قبضہ کرنے کا شرمناک واقعہ تو اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ تم نے اپنے کانّو میں بھی اس کی خبر سن لی ہو گی۔ میں نے پہلے ہی سے اس قدر شور مچایا کہ دوست دشمن سب کے کان کھڑے ہو گئے اور میرا خیال تھا کہ ہمارے جوش کو دیکھ کر ہمارے ہندو بھائی ہمارے احساسات کا پاس لحاظ کریں گے اور اس مسئلہ کا کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے گا جس سے کسی کا نقصان نہ ہو اور ہماری آبرو میں پٹّا نہ لگے، لیکن کیا کروں، ہمارے کچھ مسلمان بھائی ایسے بھی ہیں جنہوں نے ملت کی آبرو سے زیادہ اپنے دوست احباب کی خوشنودی کی فکر ہے اور ان کی وجہ سے میرا کیا کرایا کام چوپٹ ہوا۔ میونسپلٹی والے اس پر آمادہ ہو گئے تھے کہ جس میدان کو ہزاروں مسلمانوں نے اپنی سجدہ گاہ بنایا تھا، وہاں پر مسلمانوں سے جس قدر چندہ وصول ہوا اسی سے ایک مسجد بنوا دیں۔ مگر ان ہی مسلمان بھائیوں کے اکسانے سے وہ پھر اکڑ گئے۔ اور اب ان کے وہی تیور ہیں جن سے پہلے ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تھی، میں اپنے مسلمان بھائیوں کو ان کی زیادتیوں کے باوجود دنیا بھر میں ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ ان بنیوں کو ان کی بدتمیزی کا مزہ چکھا دوں گا۔ اس لیے میں نے تم کو بلایا تھا۔ تم کو شکایت تھی کہ کچھ کام کرنے کو نہیں ملتا، اب لو، اتنا کام ہے کہ کیے نہ بنے۔ ملت کو آگاہ کرو، خبردار کرو۔ آبرو بچانے کے لیے تیار کرو، مسلّح کرو، جوش اور ایثار کے کرشمے دکھانے، شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔

حسام الدین: (کاہلوں کے سے لہجے میں) جی، مجھے معاف رکھیئے۔ مجھے تو گانّو میں رہتے رہتے پھپھوندی لگ گئی ہے۔

دوڑ دھوپ کی ہمت نہیں رہی۔ خون ٹھنڈا پڑ گیا۔ سِوا دن بھر لیٹے رہنے کے اب کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔

عبدالغفور: لو، بس ہمیشہ کی سی کاہلی ...... اور سہل انکاری - ارے میاں اب وہ وقت نہیں ہے کہ پڑے پڑے کھایا کرو، اور گپ بازی کیا کرو، اب ہے وقت میدان میں قدم رکھنے کا، لڑنے مرنے کا۔ اٹھو ملت کے دامن پر داغ لگے ہیں، انھیں اپنے خون سے صاف کرو۔ خون کے سوا اور کسی چیز سے وہ دھلنے کے نہیں۔

حسام الدین: میں نے خون کی نسبت تو پہلے ہی عرض کر دیا کہ ٹھنڈا ہو گیا ہے اور اب بہائے نہ بہے گا اور اگر آپ جرح کریں تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ابھی تک پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں یہی سوچ رہا ہوں کہ خون بہانے کی کوشش کیوں کروں۔ میرے علم میں تو کوئی ایسی مسجد ہے نہیں جسے میونسپلٹی نے مسمار کر دیا ہے اور دریافت کرنے سے بھی کسی ایسی مسجد کا پتا نہیں چلا۔

عبدالغفور: میاں اسی وجہ سے تو میں کہتا تھا کہ گانوّ میں پڑے رہنے سے کام نہیں چلتا۔ ہر اخبار میں مسجد کی نسبت لمبے لمبے مضمون نکل چکے ہیں۔ مولویوں کے اس کی نسبت فتوے جاری ہوئے ہیں، شہر بھر میں عرصے تک اسی کے لیے شور مچتا رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ تم کو دریافت کرنے سے بھی نہیں ملی۔

حسام الدین: ملتی کیسے، تھی ہی نہیں۔ بھگوان ملز کے سامنے لوگ کسی کی زمین پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اب وہ وہاں مکانات بنوانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے لوگوں کو وہاں جمع ہونے کی ممانعت کر دی۔ زمین اس کی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اسے لوگوں کو وہاں جمع ہونے سے روکنے کا حق ہے، چاہے وہ نماز پڑھنے کے لیے ہی کیوں نہ جمع ہوں۔

عبدالغفور: کون کہتا ہے کہ کسی کو اس کا حق ہے کہ مسلمانوں کو کہیں پر نماز پڑھنے کی ممانعت کر دے! ذرا ہوش میں آؤ، کیسی دنیا پرستوں کی سی باتیں کر رہے ہو؟

حسام الدین: میں نے پہلے ہی عرض کر دیا کہ خون ٹھنڈا ہو گیا ہے، اب مزاج میں گرمی نہیں رہی تو خواہ مخواہ عقل کو اپنے معاملوں میں زیادہ دخل دینے پر مجبور ہوں۔ میرے خیال میں اگر لوگ بھگوان ملز کے مالک کی تجویز منظور کر لیتے اور مِل کے پچھواڑے جو زمین انھیں مفت اور ہمیشہ کے لیے مل رہی تھی اُسے حاصل کر لیتے تو فساد بھی نہ ہوتا اور اچھی خاصی زمین مل جاتی، جس پر بعد کو چاہتے تو مسجد بھی بنوا سکتے تھے۔

عبدالغفور: بھائی بس چھوڑو، چھوڑو۔ ایک بات ہو تو کوئی سمجھائے بھی۔ یہاں تو سرے سے مقدمہ پیش کرنا ہے اور پھر جج صاحب بھی کچھ مخالف۔ میں تو اس امید میں تھا کہ تم سے کچھ تقویت حاصل کروں گا۔ تم اُلٹے میری کمر توڑنے کی فکر میں ہو۔ بس جاؤ اپنے گانوّ میں چین سے رہو۔ مگر خبردار، میرے سامنے کبھی اپنے آپ کو مسلمان مت کہنا یا اگر یہ منظور نہیں تو پھر ذرا دل میں گرمی پیدا کرو، حیادار بنو، آبرو سے رہنے کا ڈھنگ سیکھو، اس طرح ادھر سے اُدھر ہنکا دیا جانا مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے۔ کسی غیر مذہب والے کے حکم سے مسجد کا

مقام بدل دینے سے اسلام کی صریحی توہین ہوتی ہے۔اور ہمارے حق میں بہرصورت یہی بہتر ہے کہ ہمارے دشمن ہم سے خائف رہیں نہ یہ کہ ہمارے عجز وانکسار سے ڈھیٹ ہوجائیں۔(خادم دروازے پر دکھائی دیتا ہے) کیوں کیا ہے؟

خادم:حضورایک صاحب آپ سے ملنے کوآئے ہیں۔

عبدالغفور: بلا لاؤ بھائی، بلا لاؤ- (خادم چلا جاتا ہے، اور چندلمحوں کے بعد حشمت داخل ہوتا ہے) ارے بھائی حشمت، یہ تم کھڑے تھے باہر۔اتنی گہری دوستی ہونے پرایسا تکلف! مگرمیری قسمت اچھی ہے تم بہت وقت سے آ گئے۔یہ دیکھوتمھارے پرانے یار حسام الدین داڑھی کھجا کھجا کرکیسی باتیں کررہے ہیں۔ذرا ان کوسمجھاؤ۔راہ راست پرلاؤ۔یہ تو گانو میں رہ کرسب کچھ بھول گئے۔خیرہم لوگوں کوبھول جاتے تو کوئی بات نہ تھی۔یہ اسلام سے بالکل بے گانگی برتنے پرآمادہ ہوگئے۔کیا گانو کی فضامیں کفر کی تاثیر ہوتی ہے۔

حشمت اللہ: (پہلے مسکراتا ہے پھرسنجیدہ چہرہ بنا کر) خیر،مگرمیں تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اب بحث کا موقع نہیں رہا اور اب لوگوں کوراہ راست پرلانے کی کوشش کرنے کے بجائے کچھ عملی کاروائی شروع کرنا چاہیے۔میونسپلٹی نے اس زمین کے چاروں طرف مسلح سپاہی کھڑے کرانے کا حکم جاری کردیا ہے اوراب جوکوئی وہاں جائے گا چاہے نماز ہی پڑھنے کیوں نہ جائے،اس کی وہ خوب خبرلیں گے۔مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔اگرآپ نے اس معاملہ کی طرف فوراً توجہ نہ کی تو ممکن ہے وہاں خون خرابہ ہوجائے۔

عبدالغفور: کیوں میاں حسام الدین سن لیا، یااب بھی تمھاراخون ویسا ہی سرد ہے؟

حسام الدین: میں کل بھگوان ملز کی طرف شام کوٹہلتا ہوا گیا تھا۔وہاں ایک بوڑھا چپراسی بیٹھا تھا،اس سے معلوم ہوا کہ اب کئی ہفتوں سے اس زمین پرنہ کوئی خوانچے والا آتا ہے نہ کوئی نمازی۔

عبدالغفور: بھئی الٹی سیدھی باتیں کرنے کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے۔میں کل حالات سے واقف ہوں۔بھائی حشمت اللہ میونسپلٹی میں ایک اعلیٰ عہدے پر ہیں۔میونسپٹی کے کل معاملات وہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔لیکن تم ہوکہ ہم دونوں کوجھوٹا سمجھتے ہو،اورایک چپراسی کی بات کوبغیر جانچنے پرتالے مان لیتے ہو۔یہ آخرکیا اندھیر ہے؟ ہاں بھئی حشمت تو پھر بتاؤ میں کیا کروں۔تم تو ایسی خبرلائے ہوکہ سنتے ہی خون ابل پڑا۔

حشمت اللہ: جناب بندے کا خون کل شام جب سے میونسپلٹی میں ریزولیوشن پاس ہوئے تب ہی سے ابل رہا ہے، میں تو ملازم آدمی ہوں۔میں تو کچھ کرسکتا نہیں۔میرا فرض آپ کوان لوگوں کی پوشیدہ کاروائیوں سے آگاہ کرنا تھا وہ میں نے ادا کردیا۔

عبدالغفور: اچھا تو بھائی سنو۔تم جلدی سے مولوی عبدالرحمان صاحب، کرم علی صاحب اور دوتین لوگوں کو ٹیلی فون کرکے یہاں بلاؤ، میں اس درمیان میں کوئی تدبیر سوچوں گا اورتم گھبراؤنہیں،انشاءاللہ آج شام تک ایک ایسا اعلان جنگ شائع ہوجائے گا کہ اسے سن کر ہی دشمن کانپ اٹھیں گے۔

حشمت اللہ: جی ہاں، اتنا تو کم از کم ہونا چاہیے۔ (اٹھ کر چلا جاتا ہے)

عبدالغفور: اب فرمایئے حسام الدین صاحب کیا ارادہ ہے، ہمارے ساتھ ہوں گے یا ہمارے دشمنوں کے؟ اتنا تو احسان کیجیے کہ اپنے ارادے سے مطلع کر دیجئے تا کہ عین وقت پر مایوسی نہ ہو۔

حسام الدین: آپ کا کوئی دشمن نظر آتا تو سوچنے کا موقع بھی تھا کہ آپ کا ساتھ دوں یا اس کا، مگر بہر حال ساتھ تو آپ ہی کا ہوگا۔ میں لڑنے کے کام کا تو رہا نہیں، آپ کی جنگ میں جو زخمی ہوں گے، ان کی تیمارداری جہاں تک ہو سکے کروں گا۔

عبدالغفور: (حسام الدین کی طرف تھوڑی دیر تک گھور کر) میاں خدا جانے کیا بہکی بہکی باتیں کرتے ہو! خیر اب جاؤ، مجھے اعلان کا مضمون سوچنا ہے۔ خدا تمھیں اتنی توفیق دے کہ اپنے بھائیوں کے درد کو محسوس کرو، اور اپنے دین کا حق ادا کرو۔ خدا حافظ

حسام الدین: خدا حافظ!

(پردہ)

دوسرا سین

سڑک اور مکانات کے درمیان خالی جگہ پر مولا بخش لہار، ایک مستری اور دو مزدور بیٹھے ہیں۔ سگریٹ کا دور چل رہا ہے۔ اسٹیج کی پشت پر ایک دروازہ ہے جس سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں داخل ہوتے ہیں۔

مولا بخش: (مستری سے) بھائی ہم تو پڑھے لکھے آدمی ہیں نہیں، ہمیں تو شریعت کا کچھ حال معلوم نہیں، ہم کو تو وہی ماننا چاہیے جو عالم لوگ ہم سے کہیں اور اب تم غور کرو کہ آج جو اعلان چھپا ہے اس میں بڑے بڑے مولویوں کے دستخط ہیں، اور سب کا فتوا ہے کہ ہر سچے مسلمان کو جان دینے پر تیار ہو جانا چاہیے۔ اس میں تو اب کچھ کہنے سنے کی گنجایش ہی نہیں، ہمارے خدا اور رسول کا حکم تو صاف ظاہر ہے۔

مستری: (ذرا ہچکچا کر) ہاں یہ تو ہے۔

مولا بخش: بس ہم نے تو یہی دل میں ٹھان لی ہے۔ آج شام کو نہا دھو کر جو اوزار ملا ہاتھ میں لیے مولانا عبدالغفور صاحب کے مکان پر پہنچ جائیں گے، رستے میں کہیں پر موقع ملا تو وہیں بھڑ جائیں گے، نہیں تو جیسا عبدالغفور صاحب کا حکم ہو، ہمیں جینے میں تو کوئی لطف آتا نہیں۔.....زندہ رہے تو بس یہی روز کی محنت روز کی فکر ہے۔ اب شہید ہونے کا موقع ملا ہے، اسے ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے.....

(کچھ دیر خاموشی کے بعد) تو پھر مستری جی کیا رائے ہے؟

مستری: ہاں بھائی ٹھیک کہتے ہو۔ اب کچھ زمانہ ہی ایسا ہے۔ ہم کو ہی دیکھو۔ کام کرتے کرتے بیس برس ہو گئے، مگر اللہ قسم ابھی تک ایک کام نہ جی سے کیا ہے نہ کوئی کام کبھی جی پر پڑا ہے۔

پہلا مزدور: ہاں سچ بات تو یہی ہے۔ اب جینے میں کوئی لطف ہی نہیں۔

مستری: ہم تو کام کرنے والے ہیں۔ جب کام کی کدر کرنے والے ہی نہیں رہے تو پھر کس کے لیے کریں؟

دوسرا مزدور: اور کمائی بھی ایسی نہیں ہوتی کہ ایک وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھا سکیں۔

مولا بخش: (انگڑائی لے کر) بس چلو کہیں کٹ مریں۔ (سب کے چہروں پر ایک غمگین مسکراہٹ آ جاتی ہے) ہمارا تو سچ مچ یہی جی چاہتا ہے .. اب جھگڑا بھی ہو گیا ہے۔ مولویوں نے جہاد کا فتوا بھی دے دیا ہے۔

پہلا مزدور: سچ استاد تم چلو تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں۔ ہمارے دل میں تو یہ بات اسی وقت سے بیٹھ گئی جب اس حرام زادے ہندو کو تو ال نے ہمارے بڑے بھائی کو جیل خانے بھجوایا۔ ہم کو ذرا بھی کوئی اشارہ کر دے تو اس پر ہاتھ صاف کر دیں۔

دوسرا مزدور: ہم نے تو کوئی ایسی اڑتی کھبر سنی تھی کہ میونسپلٹی والے کچھ پھساد کر رہے ہیں۔ آج مولوی پھتوا بھی دینے والے ہیں۔

مولا بخش: (زور سے ہنس کر) واہ جی واہ- آ تنا سب کر گئے اوران کو کچھ خبر ہی نہیں۔ارے میاں عقل مند پھساد ہو گیا۔مولویوں نے پھتوا بھی جاری کر دیا۔اب بات سمجھ میں آئی ہوتو ہاتھ میں ڈنڈا لواور چلو.....(لمبی سانس لے کر) خدا ہمارے عبدالغفور صاحب کو زندہ رکھے۔انھوں نے اتنا تو کر دیا کہ ہمیں اس دنیا سے چھٹکارا بھی ملے اور شہید بھی کہلائیں (تیسرا مزدور داخل ہوتا ہے اور مولا بخش کو دیکھ کر پوچھتا ہے) کہواستاد کیا خبر آئی؟ ہمارے گھر کے پاس بہت سے محلے والے جمع ہیں۔

مستری: ارے وہ اللہ دین کہاں بیٹھ رہا۔وہ تو خبر لانے گیا تھا کہ آج کیا ہوا ہے۔

مولا بخش: ہاں دیکھو، بس آتا ہی ہوگا۔

(خاموشی)

(اللہ دین دوڑتا ہوا آتا ہے۔اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سرخ روشنائی سے چھپا ہوا اعلان ہے)

اللہ دین: ارے چچا آج تو معلوم ہوتا ہے شہر میں بلوہ ہوگا۔(سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)۔

پہلا مزدور: کہاں؟

مستری: کیسا بلوہ؟

دوسرا مزدور: تجھ سے کس نے کہا؟

مولا بخش: لا، ذرا اعلان تو ادھر دے (اللہ دین کے ہاتھ سے اعلان لے کر بجّے کر کر کے پڑھتا ہے، مسلمانو.....اُٹھ کھڑے ہو. .....دکھا.....دو کہ تم اپنی جان.....اپنا مال.....نثار ..... کر سکتے ہو ..... آؤ شہادت .. کا شربت چکھو .....دوشمن کو بھی..... اس لام کی توہین کا مزہ چکھاؤ .....(سب مولا بخش کی رائے معلوم کرنے کے لیے اس کے منہ کو تکتے رہتے ہیں) بس چلو، ہماری امیدیں پوری ہوئی ہیں۔عبدالغفور صاحب نے جہاد کا حکم دے دیا ہے۔مولوی لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔سب کی رائے یہی ہے۔

مستری: اچھا تو یہ بھی کچھ لکھا ہے کہ کیا کریں۔

مولا بخش: اجی اب کرنا ورنا کیا؟ میں تو بس نہا دھو کر اُن ہی کے یہاں پہنچتا ہوں، کل جو سلاخیں بننے کو آئی تھیں وہی ہمارا ہتھیار ہوں گے (تیسرے مزدور سے) بس جی، تم جا کر سب سے کہہ دو کہ لڑنے کو تیار ہو جائیں..... میں یہاں سے بس تھوڑی دیر میں چلتا ہوں، جسے آنا ہو میرے ساتھ ہو لے (تیسرا مزدور ''اچھا استاد'' کہہ کر دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے)۔

پہلا مزدور: چلو استاد، ہم بھی تمھارے ہی ساتھ ہیں۔ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ دے دو!

اللہ دین: اور چچا ہم بھی۔

مستری: چلو عبدالغفور صاحب کے یہاں تک تو میں بھی چلتا ہوں۔(مولا بخش اور اللہ دین کوٹھری کے اندر چلے جاتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے مزدوروں وغیرہ کی ایک خاصی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ ڈنڈوں اور لوہے کے مختلف اوزاروں کے زمین پر پٹکے جانے کی آواز آتی ہے۔ مولا بخش صاف کپڑے پہنے نکلتا ہے۔ اس کے پیچھے اللہ دین۔ ہر طرف سے ''چلو'' ''چل کھڑے ہو'' ''اللہ مالک ہے'' کی صدائیں سنائی دیتی ہیں)۔

(پردہ)

تیسرا سین

عبدالغفور کے مکان کا کمرہ- آرایش وہی ہے جو تیسرے ایکٹ، پہلے سین میں، عبدالغفور، مولوی عبدالرحمان، کرم علی اور حشمت اللہ سب بیٹے ہیں، پردہ اُٹھتے ہی حسام الدین داخل ہوتا ہے، اور سب کو سلام کرتا ہے۔ عبدالغفور بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے سلام کا جواب دیتا ہے۔

حسام الدین: حضور، آپ کے پاس ایک پیغام لایا ہوں۔

عبدالغفور: فرمایئے۔

حسام الدین: مجھے ڈر ہے، پیغام بر ہونے کی وجہ سے کہیں مجھ پر بھی غصہ نہ اتارا جائے۔ اس لیے پہلے ہی عرض کیے دیتا ہوں کہ مجھے آپ بس ایک ٹیلی فون سمجھ لیجیے، جس نے دوسرے کی بات آپ کے کانوں تک پہنچائی ہے، اس سے میری اپنی رائے کو کوئی واسطہ نہیں۔

عبدالغفور: جی فرمایئے۔ فرمایئے!

حسام الدین: صاحب بات یہ ہے کہ میں دلدار حسین صاحب کے یہاں کچھ روپیا وصول کرنے کے لیے گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی مجھے پیغام پہنچانے پر مجبور کیا اور کہا کہ جاؤ گے نہیں تو تمھارا روپیا مارا جائے گا۔

عبدالغفور: خیر بھائی پیغام تو سناؤ۔

حسام الدین: (ذرا ہچکچا کر) صاحب انھوں نے کہا ہے کہ عبدالغفور صاحب سے دست بستہ عرض کر دو کہ یہ نیا اعلانِ جنگ جو شائع ہوا ہے اس میں ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا ہے اور اس کے نتیجے کے وہ ذمہ دار نہیں ہیں۔

عبدالغفور: تو کیا دلدار حسین صاحب کا خیال ہے کہ میں ان کے بھروسے پر کام کرتا ہوں اور کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان ہی کی طرح میں بھی ہندوؤں کی خوش نودی کے لیے اپنے دین وایمان کو طاق پر رکھ دوں؟

حسام الدین: میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ میں صرف پیغام پہنچانے آیا ہوں، اگر اجازت ہو تو باقی بھی عرض کر دوں۔

عبدالغفور: جی فرمایئے ہمارے رئیسِ اعظم نے اور کیا ارشاد فرمایا ہے؟

حسام الدین: ان کا خیال ہے کہ میونسپلٹی مقدمہ چلانے والی ہے اور پولیس کی طرف سے بھی آپ کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے۔ ان دونوں باتوں پر آپ غور کر لیجئے۔ بس اور کچھ نہیں۔

عبدالغفور: دیکھئے مولوی صاحب، عبرت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ وہی لوگ جنھیں چاہیے تھا کہ قوم کے فدائیوں کی پشت پناہ بنیں سب سے پہلے ہمارے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر خیر میں بھی ان سب سے سمجھ لوں گا۔ حسام الدین صاحب، اگر آپ.....

حسام الدین: (ہاتھ جوڑ کر) حضور مجھے بس معاف فرمایئے، میں تو اپنے روپے کی غرض سے ایک مرتبہ پیغام بر بنا تھا۔ مجھے بس اب گانّو جانے دیجیے۔ میں اور کسی کام کے لائق نہیں۔

عبدالغفور: خیر تو میں ابھی ٹیلی فون پر دلدار حسین صاحب کو ان کی حرکتوں کے نتیجے سے آگاہ کیے دیتا ہوں۔ مجھے مقدمے کی دھمکی پہلے بھی بہت دی جا چکی ہے اور اس کا جواب جو میں پہلے دیا کرتا تھا وہ اب بھی دینے پر تیار ہوں۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں اور ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں میرے جیسے ہزاروں آدمی ہیں۔ (کمرے کے باہر عبدالغفور کے نوکر کی آواز آتی ہے ''ہیں کہاں گھسے چلے جا رہے ہو؟'' اور مولا بخش کا جواب "عبدالغفور صاحب کے پاس، اور کہاں؟'' اس کے بعد مولا بخش داخل ہوتا ہے اور السلام علیکم کہہ کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے پیچھے مستری اور دونوں مزدور ہیں۔ اللہ دین دروازے سے جھانک کر باہر ہی کھڑا رہ جاتا ہے سب کے پاس لوہے کی سلاخ، ڈنڈا یا ایسی کوئی چیز ہے۔ عبدالغفور انہیں دیکھ کر بہت پریشان ہو جاتا ہے)

عبدالغفور: وعلیکم السلام کہو بھائی کیسے آئے؟

مولا بخش: ہم نے سنا تھا کہ آپ کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اسلام کے لیے جان دینے پر تیار ہوں۔ اب ہم آئے ہیں چلئے، آپ جہاں لے جایئے وہاں ہم چلیں گے، جس کسی سے کہیئے لڑ کر جان دینے پر تیار ہیں.....اور بہت سے آدمی بھی آپ کے دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔

عبدالغفور: (مولوی عبدالرحمان سے مخاطب ہو کر) دیکھئے مولانا منہ سے بات نکلی نہیں اور یہ جان باز آ کر کھڑے ہو گئے۔ اب بھی اس میں کوئی شک کر سکتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ ہتھیلی پر جان لیے رہتا ہے، اور تم بھی ذرا اس پر غور کرو۔ میاں حسام الدین دیکھو مسلمان ایسے ہوتے ہیں (مولا بخش سے مخاطب ہو کر) ہاں بھائی اس وقت ہماری آبرو تمھارے ہی ہاتھ میں ہے۔ تم ہی سردار ہو مجھے جو حکم ہو، وہ میں کرنے پر راضی ہوں۔

مولا بخش: (اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر) صاحب ہم جاہل آدمی کیا جانیں۔ آپ ہی حکم دیجیے۔ ہم تو اسی امید میں آئے تھے کہ آپ ہمارے سردار بن کر.....

عبدالغفور: ہاں بھائی، تمھاری ہمت اور تمھارے خلوص کو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ سچ مانو، اس وقت اگر تم نے بات کی اور میری آبرو رکھ لی۔ اس کا میں تمھارا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تمھارا یوں آنا اور جاں نثاری پر اس سادگی سے آمادہ ہو جانا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گا، اور تم یہ بھی نہ سمجھو کہ تمھارا یہ مبارک تحفہ مجھے منظور نہیں۔ میں ہمیشہ تم ہی لوگوں پر بھروسا کروں گا۔ جب ضرورت ہوگی تو تم ہی سے مدد مانگوں گا اچھا اب اپنے اپنے گھر جاؤ، مگر سمجھ لو کہ جان دینے کے لیے ہر سچے مسلمان کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیے، جس وقت ضرورت ہوگی تم کو فوراً معلوم ہو جائے گا۔

مولا بخش: صاحب میں تو اپنے گھر سے رخصت ہو کر آیا ہوں اور میرے پیچھے اور بہت سے لوگ آئے ہیں، اب میں جاؤں کہاں؟ آپ نے تو جہاد کا اعلان کیا تھا، ہم شہید ہونے آئے ہیں (عبدالغفور ہکا بکا ہو کہ اس کی طرف دیکھتا ہے۔ باقی سب اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔

(خاموشی)

تو صاحب، پھر کچھ حکم دیجئے کیا کریں؟

عبدالغفور: بھائی میں کیا بتاؤں، مجھے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ تم اس طرح جان دینے پر آمادہ ہو کر آئے ہو۔ ابھی لڑائی کا موقع آیا نہیں۔

مولا بخش: واہ صاحب، ہم تو یہی سمجھ کر آئے تھے۔ نہیں تو ہمیں کیا پڑی تھی کہ اپنی جگ ہنسائی کرائیں۔

(خاموشی)

عبدالغفور: نہیں بھائی تم میرا مطلب غلط سمجھے۔ میں نے میونسپلٹی والوں کو دھمکی دی تھی کہ انھوں نے مسجد توڑ ڈالی تو یہاں کے مسلمان جہاد کر ڈالیں گے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم لوگ گھر بار بیچ کر یہاں آن کھڑے ہو اور ابھی جہاد بھی کر ڈالو۔ اگر ضرورت ہوئی تو انشاءاللہ ایسا بھی کریں گے۔ اس کا میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، لیکن ابھی تو اس کا موقع نہیں ہے۔

مولا بخش: (ذرا گرم ہو کر) تو صاحب اگر آپ کو معلوم نہیں تھا کہ ہمارے جیسے جاہل اور بے قوف جہاد کا نام سن کر جان دینے کو کھڑے ہو جاتے ہیں تو آپ نے جہاد کی دھوم کاہے کو مچائی۔ آپ کا تو کچھ جاتا نہیں، ہم آپ ہی آپ الّو بنتے ہیں۔ بھلا یہ کون سی شرافت کی بات ہے۔

عبدالغفور: ہاں بھئی مجھ سے یہ قصور ضرور ہوا۔ میں سمجھتا تو تھا کہ مسلمان جہاد کا نام سن کر اٹھ کھڑے ہوں گے مگر ایسی مستعدی کا تو مجھے بھی گمان نہیں تھا۔ خیر ابھی تو ذرا صبر کرو، انشاءاللہ ایسا موقع بھی آئے گا کہ تم اپنے دین کے لیے جان دینے کی عزت حاصل کر سکو گے۔

مولا بخش: تو وہ وقت آخر کب آئے گا؟

عبدالغفور: یہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمھیں تیار رہنا چاہیے۔

مولا بخش: (داڑھی کھجا کر ذرا غصے سے) واہ صاحب، ہم کو تو آپ نے خوب ہی الّو بنایا۔ ہم سمجھتے کہ آپ اسی طرح دھوکا دیں گے تو ہم کبھی نہ آتے (سر اٹھا کر) خیر صاحب ہم پر جو گزری سو گزری مگر یہ آپ نے جو ہمارے ایمان کا منہ چڑایا اس کا بدلہ خدا، آپ سے لے گا۔ چلو بھائی مستری جی اب سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب کے سب دھوکے باز ہیں، (کرم علی کی طرف دیکھ کر) کوئی مفت کام کرنا چاہتا ہے، کوئی مفت جان لینا (سب کو آگے ڈھکیلتا ہوا چلا جاتا ہے)

حسام الدین: (مولوی عبدالرحمان کی بانہہ پکڑ کر) چلئے مولوی صاحب ورنہ غضب ہو جائے گا

مولوی عبدالرحمان: ارے بھائی میں کیا بنالوں گا؟

حسام الدین: آپ چلئے تو، (مولوی عبدالرحمان کو گھسیٹتا ہوا جلدی سے باہر چلا جاتا ہے۔ (عبدالغفور اور حشمت اللہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں،)

(پردہ)

چوتھا سین

عبدالغفور کے مکان کا پھاٹک، مولا بخش اور اس کے ساتھی اندر کی طرف سے آتے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی پہلے تو مجمع سے ''کہو بھائی کیا ہوا؟ عبدالغفور صاحب نے کیا کہا؟ جلدی آؤ جی'' کی آوازیں آتی ہیں جنہیں سن کر مولا بخش سٹ پٹا جاتا ہے۔ وہ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہے کہ حسام الدین اور مولوی عبدالرحمان بھی اندر کی طرف آتے ہیں۔

حسام الدین: او میاں خدائی فوج دار، ذرا بات تو سنو!

مولا بخش: (پہلے حسام الدین کی طرف گھور کر دیکھتا ہے، اس کے بعد منہ بنا کر) لو بھائی وہ تو کچھ نہیں تھا، مگر اب ایک صاحب واقعی جہاد کرانے آئے ہیں۔

حسام الدین: ارے میاں مجھ سے ایسی الٹی سیدھی باتیں کرو نہیں ، میں تمھارا سب کچّا چھٹّا جانتا ہوں اور کہو تو اس وقت کھڑے کھڑے کچھ سنا بھی دوں۔

مولا بخش (زمین پر لوہے کی سلاخ جو اُس کے ہاتھ میں ہے مار کر) اچھا صاحب سنایئے؟

حسام الدین: سناؤں .....تم کاہل ہوا، اور چاہتے ہو سب تمہاری عزت کریں۔ تم سے کام وام کچھ ہوتا نہیں۔ اتنی محنت کرنا نہیں چاہتے کہ روٹی کما سکو، اور اب موقع ملا تو کھڑے ہو گئے جہاد کرنے۔ بھلا تم جیسوں کی قسمت میں جہاد ہو سکتا ہے؟ تم نے دنیا میں چھوڑا کیا ہے کہ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے؟

مولا بخش: (کچھ حیران ہو کر) صاحب ہم کیسے بھی ہوں آپ ہم کو برا بھلا کہنے والے کون ہوتے ہیں۔

حسام الدین: ہوتے کیوں نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے اتنے آدمیوں کو لا کر کھڑے ہوتے ہو اور کہتے ہو، اسلام کے لیے جان دینے آئے ہیں۔ ہم کو دھوکے باز اور جھوٹا بناتے ہو، اور چاہتے ہو، ہم منہ سے کچھ کہیں بھی نہیں تم سے۔ آخر کس نے جہاد کرنے کو کہا تھا؟

مستری: ہم کیا جانیں صاحب، ہم نے تو بس اعلان پڑھا تھا۔

حسام الدین: اور ایک اعلان پڑھ کر تم نے طے کر لیا بس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ بھائی ہم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہیں کہ ایسے چکموں میں آ جائیں، تم اگر کسی کام میں مصروف ہوتے، گھر بار کا ذمہ ہوتا، بیوی بچوں کی پرورش کا خیال ہوتا تو ہرگز اتنی جلدی جہاد پر تیار نہ ہوتے، جہاد کو بھی تم نے کوئی ہنسی ٹھٹھا سمجھ لیا ہے، اپنا چونّی کا کام سلیقے سے ہوتا نہیں، خدا کا کام کرنے کو جھٹ تیار ہو گئے۔ تم کو بھی تو آخر خدا نے سمجھ دی ہے، حیا دی ہے۔ دنیا میں کسی مصرف کے نہیں تو خدا کے کس کام آ سکتے ہو، اور ہمارے پاس آئے ہو تو ہم تم سے کرائیں کیا۔ تم نے اب تک کیا کر دکھایا ہے جو تمہارے اوپر کوئی بھروسا کرے؟ (مولا بخش خاموشی سے زمین کی طرف تکتا رہا ہے اور کچھ نہیں کہتا) کیوں میاں .....خدائی فوج دار، اب کیوں نہیں؟ کہو تو کرم علی صاحب کو بلاؤں اور سارا قصہ پھر سے سنوا دوں۔ تمہارے جیسے بہتروں سے

نپٹ چکا ہوں۔

پہلا مزدورہ: صاحب ہم تو غریب آدمی ہیں.....

حسام الدین: بس رہنے دو جی، ہم بھی جانتے ہیں کیسے غریب ہو۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد) بس جاؤ اپنے گھر بیٹھو۔ جب دنیا میں کچھ آبرو حاصل کرلو، تب جہاد کی فکر کرنا۔ پھر ہم بھی جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے (مجمع کی طرف مخاطب ہوکر) سن لیا آپ لوگوں نے، یہ کیسے لوگ ہیں جو جہاد کرنے چلے ہیں.....واقعی بڑی شرم کی بات ہے کہ آپ میں ایک بھی ایسا نہ نکلا جوان لوگوں کو سمجھاتا، جو انہیں یاد دلاتا کہ ہمارے رسولؐ نے بھی جہاد کیا تھا اور ہمیں بتا گئے ہیں کہ جہاد کب کرتے ہیں اور کیسے کرتے ہیں۔ آپ یہاں پر دکھانے کے لئے آئے ہیں کہ سب مسلمان ہیں اور مذہب کے لئے لڑنے پر تیار ہیں۔ بھلا آپ میں سے کسی کو یہ بھی یاد ہے کہ جہاد کرنے سے پہلے ہمارے رسولؐ نے اپنے جانی دشمنوں کو دوست بنانے کی کتنی کوششیں کیں۔ لڑائی سے بچنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں، کیا کیا قربانیاں کیں اور اس پر بھی جب لڑے تو ان کو کتنا رنج ہوا؟.....آپ لوگ بھی لڑنے کو آئے ہیں، بھلا بتایئے آپ نے ان مصیبتوں کا آدھا، چوتھائی حصہ بھی جھیلا ہے جو رسولؐ اللہ اور ان کے ساتھوں پر گزریں، آپ مین سے کس نے نقصان اٹھایا ہے، کس نے قربانیاں کی ہیں.....آپ سمجھتے ہیں کہ آپ غریب ہیں، آپ کو دنیا میں کچھ نہیں ملا تو عاقبت کے لئے شہادت پا کر نجات کا سامان کرلیں، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی اتنا غریب نہیں جتنے ہمارے رسولؐ تھے، کسی نے اتنے فاقے نہیں کیے ہیں جتنے ہمارے رسولؐ نے۔ دنیا کی کون سی نعمت ہے جو انہیں نہیں مل سکتی تھی، لیکن انہوں نے ہر نعمت سے اپنے آپ کو محروم رکھا، اور کیوں؟ صرف اس لیے کہ خدا کے غریب بندوں کے لیے مثال بن سکیں۔

جایئے اپنی غریبی کی شان نہ کھویئے، اپنے رسولؐ کی لاج رکھ لیجیے!

(حسام الدین، مولوی عبدالرحمان کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے باقی سب خاموش کھڑے رہتے ہیں)

پہلا مزدور: چلو پھر استاد، اب یہاں کھڑے کھڑے کیا کریں گے؟

(سب سر جھکائے چلے جاتے ہیں۔ مولا بخش ناک صاف کرتا ہے اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہے)

(پردہ)

چوتھا ایکٹ

پہلا سین

دلدار حسین کے مکان کا کمرہ، وہی جو دوسرے ایکٹ پہلے سین میں تھا۔

مولوی عبدالرحمان ایک کوچ میں بیٹھے ہیں۔ دلدار حسین داخل ہوتا ہے۔

صاحب سلامت کے بعد دلدار حسین قریب بیٹھ جاتا ہے۔

دلدار حسین: معاف فرمائے گا۔ مولانا آپ کو اس قدر تکلیف دی، لیکن اب طوفان گزر گیا ہے۔ آپ کو بھی کچھ سکون ہوگا۔ اس لئے میں نے بھی آپ کو زحمت دینے کی جرأت کی۔ عبدالغفور رصاحب کو آپ نے میرا پیغام پہنچا دیا ہوگا۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں، میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا اور آپ کی وہ تجویز غالباً منظور کر لیں گے۔ اس کی مصلحت ان کی سمجھ میں ایک واقعے کی وجہ سے بھی آ گئی۔ آپ نے اسے سنا نہ ہوگا۔ اس لیے عرض کرتا ہوں: جس دن ان کا وہ مشہور اعلانِ جنگ شائع ہوا تھا، ان کے پاس ایک لُہار، ایک مستری اور کچھ مزدور ہتھیار باندھ کر پہنچے اور کہنے لگے کہ صاحب چلیے ہم جہاد کرنے آئے ہیں۔ عبدالغفور صاحب ویسے خاصے بہادر آدمی ہیں، مگر ایسے بھی نہیں کہ چند آدمیوں کی فوج لے کر لڑنے کو کھڑے ہو جائیں۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر اور پیٹھ ٹھونک کر ان لوگوں کو واپس گھر بھیجنا چاہا، مگر وہ سب تو گھر بیچ کر آئے تھے، خوب خفا ہوئے۔ خیر وہ لوگ تو خفا ہو کر باہر چلے گئے، مگر عبدالغفور صاحب کے دل پر اس کا بہت اثر ہوا۔ ان کی بھی بالکل نہیں تو کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا ہے کہ موقع بے موقع ملت کی آبرو داؤ پر لگا دینا اور جہاد کا ڈنکا بجا دینا خطرناک ہے اور دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں کو بھی اس کی وجہ سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ مگر صاحب، اس لہار کو، جو ان مجاہدوں کا سرگروہ تھا ہمارے حسام الدین نے بھی خوب ٹھیک کیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ وہ حسام الدین کے گانو پہنچ گیا ہے اور اس کے ساتھ شاید ایک دو آدمی اور ہیں۔

دلدار حسین: جی ہاں۔ مولانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں خود اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ قومی اور ملی زندگی کی تعمیر کے لیے ہمارے پاس کافی سامان موجود ہے۔ اگر ہم صرف اسے کام میں لانے کا طریقہ سمجھ لیں۔ ہم پر ابھی دولت اور حکومت کا نشہ چڑھا ہے، اگرچہ دولت اور حکومت دونوں مدت ہوئی ہمارے ہاتھ سے نکل گئیں۔ اگر یہ نشہ جو ہمارے دماغ کو بے کار کیے ہوئے ہے، اُتر جائے، ہم ہوش میں آئیں اور حقیقت سے آگاہ ہوں تو پھر ہم دنیا میں بڑی حیثیت پیدا کر سکتے ہیں، مگر افسوس ہے ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کو نشے سے چور رکھنا چاہتے ہیں اور اسی میں سمجھتے ہیں کہ قوم کی عزت اور آبرو ہے۔ ہم مسلمان کیا ہیں، گویا کائنات کے سارے کارخانے کا دارومدار ہمارے ہی اوپر ہے۔ ہم نے کلمہ کیا پڑھ لیا ہے کہ ہر عیب سے پاک اور ہر بلا سے محفوظ ہو گئے۔ خود پرستی اور تکبّر نے

ہماری عقل پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ اپنی رسوائی کی بھی ہم کو خبر نہیں اور ہم اس مہلک خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہم چاہے جیسے ناہنجار کیوں نہ ہو جائیں، ایک نعرۂ تکبیر ہمیں پھر انسان اور مسلمان بنا دے گا۔ مجھے نعرۂ تکبیر کے جادو میں کوئی شک نہیں۔ شک ہے تو اس میں کہ ہمارے دل اس کا اثر قبول کر سکیں گے یا نہیں، مگر کیا کہوں، مولانا منہ کھولتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ہم نے فرض کر لیا ہے کہ بیداری کے معنی دوسروں سے لڑنا جھگڑنا ہے۔ کوئی سچی نیت سے بھی مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کرے تو اس پر فوراً الزام لگتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں آپ بجا فرماتے ہیں۔ (خاموشی)

دلدار حسین: خیر مولانا، ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ بھگوان داس صاحب، مل کے کارکنوں کے بچوں کا ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام انھوں نے میرے سپرد کیا ہے۔ آپ غالباً یتیم خانے سے دو چار طالب علم تو ایسے دے سکیں گے جو اسکول میں پڑھا سکیں، اس کے علاوہ اگر آپ اس کی نگرانی بھی اپنے ذمہ لے لیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

مولوی عبدالرحمان: جی ہاں، بہت خوشی سے۔

دلدار حسین: اسکول کے اخراجات تو زیادہ نہ ہوں گے۔ اور بھگوان داس صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ آدھا خرچ وہ دیں گے۔ لیکن اگر آپ نگرانی کا ذمہ لیں تو میں سرمایہ فراہم کرنے پر تیار ہوں، اور آپ کو اس کا بھی حق ہوگا کہ تعلیمی ضرورتیں دیکھ کر خرچ کو بڑھا دیں۔ مل میں قریب ایک ہزار ملازم ہیں اور آپ کے اسکول میں تین چار سو لڑکے ضرور ہوں گے۔

مولوی عبدالرحمان: معاف فرمائیے گا۔ میں ابھی اچھی طرح سے سمجھا نہیں۔ آپ جو رقم ضروری ہوگی وہ خود ماہوار یا سالانہ دیں گے یا اتنا جمع کر دیں گے کہ اس سے کام چلتا رہے۔

دلدار حسین: اتنا تو شاید میں فی الحال نہ دے سکوں کہ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ مگر آپ مطمئن رہیں۔ آپ نے جس ہمّت اور استقلال سے اپنے یتیم خانے کا کام چلایا ہے۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ پر دولت نثار ہوتی رہے گی۔ آپ کو انشاء اللہ میرے جیسے ہزاروں مل جائیں گے۔

مولوی عبدالرحمان: جہاں تک روپے کا تعلق ہے آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ کام کرنے والے پر دولت نثار ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں صرف کام کرنے والوں کی کمی نہیں قدر دانوں کی اس سے زیادہ کمی ہے۔ شروع میں میرے کئی سال لوگوں کو محض یہ سمجھانے میں لگے کہ یتیم خانے پر اتنی محنت اور توجہ صرف کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ یتیموں کو عید بقر، عید یا شادی بیاہ کے موقعوں پر پیٹ بھر کے کھانا کھلانا تو سب ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر انہیں اچھی تعلیم دینا سب کو بے کار کی دردسری معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں شہرت اور اثر حاصل کرنے کا موقع نہیں۔ جو لوگ اس کام کو اچھا سمجھتے ہیں انھیں بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اگر کوئی سلیقے کا آدمی اسے اپنے ذمے لے لے،

آپ کے اور حسام الدین کے سوا مجھے ابھی تک کوئی ایسا نہیں ملا ہے جس نے اس کام کو توجہ کے قابل سمجھا ہو، اور مجھے اسی میں لگے رہنے کا مشورہ دیا ہو۔ (نوکر داخل ہوتا ہے)

دلدار حسین: (مسکرا کر) جی ہاں، حسام الدین کے تو آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں۔ حسام الدین کے کیا کہنے ہیں (خادم سے مخاطب ہو کر) کیوں کیا ہے؟

خادم: حضور حشمت اللہ صاحب تشریف لائے ہیں۔

دلدار حسین: بلا لاؤ، دیکھئے مولانا، قوم کے ایک بڑے خیر خواہ تشریف لائے ہیں۔ یہ حضرت جاسوسی نہ کرتے تو عبدالغفور صاحب بچارے کو کبھی جہاد کا خیال بھی نہ ہوتا (حشمت اللہ مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہے اور جھک کر سلام کر کے ایک طرف بیٹھ جاتا ہے، دلدار حسین اور مولوی عبدالرحمان سلام کا جواب دیتے ہیں) کہئے جناب جی بھر کر فساد کر لیا، یا ابھی کوئی کسر باقی ہے؟

حشمت اللہ: (نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر اور سر جھکا کر) آپ بزرگ ہیں، جو جی چاہے کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اوروں کی طرح دھوکا ہوا ہے اور میں نے بھی دھوکا کھا کر نقصان ہی اٹھایا ہے۔

دلدار حسین: خیر یہ تو آپ جانے اور آپ کا خدا جانے، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ آپ اسی طرح دھوکے کھاتے رہے تو آپ کی نوکری جائے گی۔ میونسپلٹی والوں نے آپ کے خلاف کارروائی شروع کی تھی، مگر اس مرتبہ کسی وجہ سے رہ گئے۔ آئندہ ذرا وہ زیادہ سختی کریں گے اور کیا معلوم بورڈ میں جو مسلمان ممبر ہوں، اُن میں اتنا ملی جوش ہو، یا نہ ہو کہ آپ کو بچا لیں۔

حشمت اللہ: (نہایت نیاز مندانہ لہجے میں) جناب والا، میں تو دولت خانے پر اسی کا شکریہ بجالانے حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا، اور مجھے ایک مصیبت سے بچا لیا۔ اب آئندہ انشاءاللہ زیادہ احتیاط کروں گا.....

دلدار حسین: خیر تو پھر بہت اچھا ہے۔..... پھر فرمائیے مولانا۔ بھگوان داس سے کب ملاقات کراؤں؟

مولوی عبدالرحمان: جب آپ کو فرصت ہو، میں تو ہر وقت حاضر ہوں۔

دلدار حسین، بہت اچھا تو پھر میں ان سے طے کر لوں گا بلکہ بہتر ترکیب یہ ہے کہ حشمت اللہ صاحب کل ہی ان سے مل لیں اور اگر ہو سکے تو انھیں میونسپلٹی سے بھی کچھ اصول کرنے پر آمادہ کر لیں۔ انھیں بھی تو آخر قوم کی کچھ خدمت کرنا چاہیے۔

(حشمت اللہ سر جھکا لیتا ہے۔ دونوں اس کی طرف کچھ دیر دیکھتے ہیں، دلدار حسین مسکراتا ہے)

(پردہ)